

## دارالمصنفین شبلی اکیڈمی کا علمی و دینی ماہنامہ

### معارف

جلد نمبر ۱۹۳	ماہ ربیع الاول ۱۴۳۵ھ مطابق ماہ جنوری ۲۰۱۲ء	عدد ۱
مجلس ادارت	شذرات	۲
مولانا سید محمد رابع ندوی	مقالات	۵
لکھنؤ	قتلِ عمد میں قصاص اور دیت ہے، معافی نہیں	۲۵
پروفیسر ریاض الرحمن خاں شروانی	علامہ شبلی نعمانی اور ان کے	۳۸
علی گڑھ	تعلیمی تصورات کی عصری معنویت	۵۸
(مرتبہ)	پروفیسر اختر الواسع	۷۲
اشتیاق احمد ظلی	فنِ تاریخ گوئی میں علمائے باقیات کا حصہ	۷۵
محمد عمیر الصدیق ندوی	ڈاکٹر راہی فدائی	۷۶
دارالمصنفین شبلی اکیڈمی	قیام امن سے متعلق عیسائیت کی تعلیمات	۷۷
پوسٹ بکس نمبر: ۱۹	اسلام کے تناظر میں	۸۰
شبلی روڈ، اعظم گڑھ (یو پی)	ڈاکٹر توقیر عالم فلاحی	
پین کوڈ: ۲۷۶۰۰۱	اخبار علمیہ	
	ک، ص اصلاحی	
	معارف کی ڈاک	
	بارہویں و تیرہویں صدی ہجری کے	
	چند اہم ہندوستانی قلمی سفر نامے	
	عارف نوشاہی	
	دارالمصنفین اور مولانا مودودیؒ	
	احمد سعید	
	مطبوعات جدیدہ	
	ع-ص	
	رسید مطبوعہ کتب	

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

## شذرات

کچھ دنوں پہلے تک جنوبی افریقہ نسلی انتہا پسندی، انسانی حقوق کی پامالی اور ظلم و استحصا کے بدترین نظام کے لیے ایک علامت کی حیثیت رکھتا تھا۔ نسلی علاحدگی پسندی کی اساس پر قائم ہونے والے اس نظام کو Apartheid کے نام سے جانا جاتا تھا۔ انسانیت کی تذلیل کے اس بدترین مظہر کو وہاں قانونی اور دستوری درجہ حاصل تھا۔ وہاں کے باشندے صدیوں سے اس ظلم و ستم کے شکار تھے۔ اس سرزمین پر ۱۶۵۲ میں ڈچ طالع آزمائوں نے قدم رکھا۔ بعد میں یہاں جب ہیرے اور سونے کے وسیع ذخائر دریافت ہوئے تو یہ علاقہ یورپی طالع آزمائوں کے درمیان شدید کشمکش کی آماجگاہ بن گیا اور اس خطہ پر تسلط قائم کرنے کے لیے کوششوں میں بہت تیزی آگئی۔ اسی کشمکش کا ایک مظہر بوزوں کے خلاف انگریزوں کی جنگ تھی جو Anglo - Boer War کے نام سے جانی جاتی ہے۔ پہلی بوز جنگ ۸۱-۱۸۸۰ میں لڑی گئی۔ اس میں انگریز ناکام رہے۔ ۱۹۰۲-۱۸۹۹ کے درمیانی عرصہ میں دوسری بوز جنگ لڑی گئی جس میں انگریزوں کو کامیابی حاصل ہوئی۔ اس طرح یہ علاقہ تاج برطانیہ کے زیر نگیں آ گیا۔ ڈچ اور برٹش قبضہ کے دوران نسلی علاحدگی پسندی اور نسلی بنیادوں پر استحصا کا نظام رائج رہا۔ اقتدار کا ارتکاز پوری طرح سفید فام اقلیت کے ہاتھ میں تھا اور سیاہ فام اکثریت کی اس میں کسی درجہ میں بھی ساجھے داری کی گنجائش نہیں تھی۔ برٹش گورنمنٹ نے ۱۹۳۱ میں اس علاقہ کو خود مختاری دے دی۔ ۱۹۴۸ کے الکشن میں نیشنل پارٹی کی کامیابی نسلی انتہا پسندی کے تناظر میں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس پارٹی کی حکومت میں نسلی علاحدگی پسندی کے نظریہ کو اسٹیٹ پالیسی کے طور پر اختیار کر لیا گیا اور ظلم، جبر، نا انصافی اور استحصا پر مبنی اس نظام کو دستوری اور قانونی حیثیت دے دی گئی۔ مقامی آبادی جس نوعیت کے نسلی تعصب کی شکار تھی عہد حاضر میں اس کی مثال صرف اسرائیل میں ملتی ہے جہاں عملاً وہی ظالمانہ نظام رائج ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ جنوبی افریقہ کی اس پالیسی کے خلاف دنیا نے ایک سخت اور متحدہ موقف اختیار کیا تھا جب کہ سب نے اسرائیلی مظالم کے خلاف آنکھیں بند کر رکھی ہیں۔ اس ظلم کے خلاف جدوجہد بھی ہوتی رہی لیکن وہ بہت زیادہ موثر ثابت نہیں ہوئی۔ پھر اسی خاک سے ایک شخصیت اٹھی اور اس خطہ کے تاریک افق پر صبح امید بن کے طلوع ہوئی اور ظلم و جبر کے اس بدترین نظام کے خلاف جدوجہد کی علامت بن گئی۔ اس نے یہ ثابت کر دیا کہ اگر انسان کے اندر اخلاق کی طاقت ہو، اگر اسے اپنے مقصد پر اذعان اور یقین کی دولت حاصل ہو،

اگر اسے عزم و حوصلہ کا حصہ وافر ملا ہو تو مشکل ترین حالات میں بھی کامیابی قدم چومتی ہے اور وہ منزل مراد تک پہنچنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ عہد حاضر کے عظیم قائد نلسن منڈیلا کی زندگی اس کا جیتا جاگتا ثبوت ہے۔ غیر معمولی عزم و حوصلہ کی یہ داستان اس لائق ہے کہ اسے پڑھا جائے اور اس سے سبق حاصل کیا جائے۔ حالات کا بدترین جبر بھی اس کے ہونٹوں پر ہمیشہ سچی رہنے والی مسکراہٹ کو چھیننے میں کامیاب نہیں ہو سکا۔ سیاسی قیادت کے ہمہ گیر بحران کے اس دور میں اس کی شخصیت تپتے ہوئے صحرا میں ایک شاداب نخلستان کی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ۵ دسمبر کو جب اس نے اس جہان فانی سے رخت سفر باندھا تو جنوبی افریقہ کے اس درد کو پوری دنیا نے محسوس کیا۔

نلسن منڈیلا ۱۸ جولائی ۱۹۱۸ کو جنوبی افریقہ کی ایک بستی قونو میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد اپنے قبیلہ کے سردار تھے لیکن ان کی کم عمری ہی میں ان کا انتقال ہو گیا۔ ابتدائی تعلیم کے بعد قانون کی تعلیم حاصل کی اور وکالت کا پیشہ اختیار کیا۔ وطن عزیز کے حالات سے منڈیلا کے دل و دماغ کا متاثر ہونا ایک فطری امر تھا۔ اس کے نتیجے میں وہ اس کے خلاف برپا جدوجہد میں شریک ہو گئے اور افریکن نیشنل کانگریس کی پتھ ونگ میں شمولیت اختیار کر لی۔ ۱۹۶۱ میں مسلح بغاوت کے الزام میں گرفتار کیے گئے۔ اس مقدمہ میں انہوں نے اپنا دفاع خود کیا۔ عدالت میں ان کی تاریخی تقریر چار گھنٹہ تک چلتی رہی۔ ظلم و جبر کے ایوانوں میں اس کی گونج مدتوں سنائی دیتی رہی۔ اس میں انہوں نے یہ امید ظاہر کی تھی کہ وہ اس مقصد کو پورا ہوتے ہوئے دیکھنے کے لیے زندہ رہیں گے۔ لیکن اگر اس کے حصول کی راہ میں ان کو اپنی زندگی کا نذرانہ بھی پیش کرنے کی ضرورت پڑی تو وہ اس سے بھی گریز نہیں کریں گے۔ اس مقدمہ میں ان کو سزا ہو گئی اور وہ جزیہ رابن میں قید کر دیے گئے۔ جنوبی افریقی کے حریت پسندوں کے لیے اس جزیہ کی وہی حیثیت تھی جو ہندوستان کے مجاہدین آزادی کے لیے کالا پانی کی۔ دور حاضر کے کسی سیاسی قیدی کی یہ سب سے طویل قید تھی۔ جب وہ قید کیے گئے تھے تو ان کی عمر ۴۴ سال تھی اور جب وہ ۱۹۹۰ میں رہا کیے گئے تو وہ اپنی عمر کی ۱۷ منزلیں طے کر چکے تھے۔ ان کی قید کے دوران پوری ایک نئی نسل تیار ہو گئی۔ ان کو ایک کان میں پتھر توڑنے پر مامور کیا گیا۔ اس دوران منڈیلا نے نہ جانے کتنی چٹانیں توڑ ڈالیں لیکن اس عہد کی طویل ترین قید کی یہ مشقت بھی ان کے عزم و حوصلہ کو توڑنے میں کامیاب نہ ہو سکی۔ اور بالآخر اس ظالمانہ نظام کو ان کے سامنے جھکنا پڑا۔ طویل اور مشکل مذاکرات کے بعد جو ۱۹۸۶ سے جاری تھے فروری ۱۹۹۰ میں ان کو جیل سے رہا کر دیا گیا۔ ان کے ہم وطنوں نے اپنے اس قائد کے استقبال کے لیے دیدہ و دل کو جس طرح فرش راہ کیا ہو گا اس کا اندازہ باسانی لگایا جاسکتا ہے۔

اپریل ۱۹۹۴ میں جنوبی افریقہ میں پہلے آزادانہ الیکشن کا انعقاد ہوا اور ایک بڑی اکثریت سے منڈیلا

صدر منتخب کر لیے گئے۔ ۱۰ مئی ۱۹۹۴ کو انہوں نے جنوبی افریقہ کے پہلے سیاہ فام صدر کی حیثیت سے ذمہ داری سنبھالی۔ یہ ان کی قائدانہ صلاحیت کا بہت سخت امتحان تھا۔ ملک کی ۸۰ فی صد آبادی سیاہ فام تھی جو ایک مدت دراز سے شدید ترین مظالم اور استحصال کی شکار رہی تھی۔ سفید فام اقلیت نہ صرف یہ کہ ملک کے تمام وسائل پر قابض تھی بلکہ اس نے یہاں کے باشندوں کو انسانیت سوز مظالم کا نشانہ بنایا تھا۔ ایسی صورت حال میں سیاہ فام اکثریت کے دل و دماغ میں جذبہ انتقام کا پیدا ہونا اور سفید فام اقلیت کے اندر خوف و ہراس اور مستقبل کی طرف سے مایوسی کا پیدا ہونا ایک فطری امر تھا۔ بحیثیت صدر منڈیلا کا اصل کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے اپنے ہم وطنوں کو اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ ان لوگوں کو معاف کر دیں جنہوں نے ان کو بدترین مظالم کا نشانہ بنایا تھا اور ان کے ساتھ مل کر ملک کے مستقبل کی تعمیر کریں۔ اسی کے ساتھ ساتھ سفید فام اقلیت کو انہوں نے حوصلہ دیا اور ان کے اندیشوں کو دور کیا۔ حکومت سازی میں انہوں نے ہر طبقہ کے نمائندوں کو شریک کیا۔ ڈی کلرک کو جس سے انہوں نے صدارت کا چارج لیا تھا اپنا اول نائب صدر مقرر کیا۔ یہ کوئی معمولی کام نہیں تھا لیکن منڈیلا کی قائدانہ بصیرت اور اخلاقی ساکھ نے یہ کارنامہ کر دکھایا اور ظالم اور مظلوم دونوں کو اس بات پر آمادہ کر لیا کہ وہ متحد ہو کر ملک کے مستقبل کو سوار نے میں اپنا کردار ادا کریں، بالکل ایسے ہی جیسے یکسر مختلف اور متضاد رنگ مل کر قوس قزح کی حسین صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ غالباً اسی وجہ سے جنوبی افریقہ کو قوس قزح قوم (Rainbow Nation) کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ قومی مصالحت کے اس عمل کو مضبوط بنیادوں پر استوار کرنے کے لیے یہ ضروری تھا کہ اسے سچائی اور انصاف کی بنیاد پر قائم کیا جائے۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے افریقی چرچ کے مشہور رہنما ڈیسمنڈ ٹوٹو کی قیادت میں Truth and Reconciliation Commission قائم کیا تاکہ معافی اور انصاف کے درمیان صحیح توازن قائم کیا جاسکے۔ ۱۹۹۹ میں اپنا پہلا دور صدارت ختم ہونے کے بعد انہوں نے دوبارہ صدر بننے سے انکار کر کے ایک اور قابل تقلید مثال قائم کی۔ وہ دنیا بھر میں ظلم و جبر کے خلاف جدوجہد کی علامت بن گئے۔ جنوبی افریقہ میں ان کی حیثیت بابائے قوم کی تھی۔ چنانچہ ان کا انتقال اس ملک کے لیے ایک بڑا قومی سانحہ تھا۔ دس دن کے قومی سوگ کی جو تفصیلات سامنے آئی ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس میں اس سانحہ پر شدید رنج و غم کے ساتھ ان کے کارناموں پر بجا طور پر فخر اور مسرت کا جذبہ بھی شامل رہا ہے۔ انہوں نے اپنے ہم وطنوں اور وسیع تر عالم انسانیت کے لیے جو گراں قدر ورثہ چھوڑا ہے اس کا ان کو بھرپور احساس بھی ہے اور اس پر بے پایاں فخر بھی۔ ان کا سوگ پوری دنیا میں منایا گیا۔ ان کی تعزیت کے لیے جتنے عالمی قائدین اور رہنماؤں نے جنوبی افریقہ کا سفر کیا اس کی مثال کم ہی ملے گی۔ کتنا جی چاہتا ہے کہ ہمارے درمیان بھی ایسے لوگ ہوتے۔ اس کا سب سے زیادہ حق تو رحمۃ اللعالمین کے پیروں ہی کو پہنچتا ہے۔

## مقالات

# قتلِ عمد میں قصاص اور دیت ہے، معافی نہیں

الطاف احمد اعظمی

(۲)

سنح کے علاوہ یہ بات بھی پیش نظر رہے کہ ہر قوم کو جو شریعت دی جاتی ہے وہ اس کی عادات و نفسیات اور اس دور کے سماجی اور تمدنی حالات کے مطابق ہوتی ہے اور اسی کی اقامت اس سے مطلوب ہوتی ہے (دیکھیں سورہ مائدہ، آیات ۴۴ تا ۴۷)۔ یہودیوں اور عیسائیوں کو ان کی اپنی شریعت کی اقامت کا حکم دینے کے فوراً بعد فرمایا گیا ہے:

وَأَنْزَلْنَا إِلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ الْكِتَابِ وَمُهَيِّمًا عَلَيْهِ فَاحْكُم بَيْنَهُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ وَلَا تَتَّبِعْ أَهْوَاءَهُمْ عَمَّا جَاءَكَ مِنَ الْحَقِّ لِكُلِّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَمِنْهَاجًا وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ لَجَعَلَكُمْ أُمَّةً وَاحِدَةً وَلَكِنْ لِّيَبْلُوَكُمْ فِي مَا آتَاكُمْ فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرَاتِ

اور (اسی طرح اے نبی امی) ہم نے تمہاری طرف کتاب برحق بھیجی ہے جو اپنے سے قبل موجود کتاب (یعنی تورات) کی تصدیق کرنے والی اور اس کی محافظ ہے۔ پس تم اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق ان کے درمیان فیصلہ کرو اور حق سے ہٹ کر جو تمہارے پاس آچکا ہے، ان کی 'اہوا' (یعنی من گھڑت شریعت) کی پیروی نہ کرو۔ (اس بات کو یاد رکھو کہ) ہم نے تم میں سے ہر ایک (مذہبی گروہ) کے لیے ایک شریعت اور طریقہ مقرر کیا ہے۔ اگر اللہ چاہتا تو تم سب کو ایک ہی امت بنا دیتا (یعنی سب قوموں کی شریعت اور

(مائدہ: ۴۸)

طریقہ عمل ایک جیسا ہوتا) لیکن اس نے (ایسا نہیں کیا بلکہ) چاہا کہ جو شریعت اس نے تمہیں دی ہے اس میں تمہاری آزمائش کرے۔ لہذا (ظاہر شریعت میں فرق کی وجہ سے باہم جھگڑا کرنے کے بجائے) نیکی اور بھلائی کی باتوں میں (جو مقصود شریعت ہے) سبقت کرو۔

مذکورہ آیات میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو صاف طور پر حکم دیا گیا ہے کہ وہ صرف اس شریعت کی اتباع کریں جو ان کے پاس بذریعہ وحی بھیجی گئی ہے اور اہل کتاب کی خود ساختہ شریعت کی پیروی نہ کریں۔ معلوم ہوا کہ اہل ایمان (مسلمان) سابقہ شریعت کے مکلف نہیں ہیں۔ اگر سابقہ شریعت کے احکام محرف نہ ہوں یا ان کو اللہ نے منسوخ نہ کیا ہو تو بھی وہ احکام اسلامی شریعت کے احکام نہیں ہو سکتے ہیں۔ چونکہ ہر شریعت جیسا کہ اس سے پہلے لکھا گیا، اپنے عہد کے سماجی اور تمدنی حالات کے تابع ہوتی ہے اس لیے کسی دوسری قوم پر جس کے تمدنی حالات مختلف ہوں اس کو منطبق نہیں کیا جاسکتا ہے۔

اس کے علاوہ یہ بات فراموش نہ ہو کہ اسلامی شریعت کے علاوہ جو ہر دور کے لیے ہے اور ہر پہلو سے کامل ہے، وہ دوسری تمام شریعتیں نامکمل ہیں۔ اس کی ایک مثال خود قتل عمد کی سزا ہے۔ موسوی شریعت میں جیسا کہ ذکر ہو چکا ہے، قصاص اور معافی ہے۔ اس کے برعکس عیسوی شریعت میں صرف معافی ہے۔ اسلامی شریعت نے اس شرعی ناتمامی کو اس طرح دور کیا کہ قتل عمد کی سزا قصاص اور شاذ حالات میں دیت مقرر کی گئی اور قتل خطا میں دیت اور معافی۔ اس مکمل اور محفوظ شریعت کی موجودگی میں کسی ناتمام یا محرف شریعت پر عمل کرنا بڑی نادانی کی بات ہوگی۔ حیرت ہے کہ بہت سے علماء و فقہاء سے یہ امور کیوں کر مخفی رہ گئے۔

صحابہ کرامؓ اور تابعینؓ عظام: جناب بدر احمد مجیبی صاحب نے قتل عمد کی سزا سے متعلق کئی صحابہؓ اور تابعینؓ کے اقوال نقل کر کے بتایا ہے کہ یہ سب اہل علم و تقویٰ قتل عمد میں معافی کو درست سمجھتے تھے۔ اس کا مطلب تو یہ ہوگا کہ صحابہؓ اور تابعینؓ سورہ بقرہ کی آیات ۱۷۸ اور ۱۷۹ سے جن

میں قتل عمد کی سزا کا واضح ذکر ہے، بے خبر تھے۔ اس کے علاوہ یہ بھی ماننا ہوگا کہ فتح مکہ کے موقع پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جو خطبہ دیا اور اس کا ذکر ہو چکا ہے، اس میں صاف لفظوں میں فرمایا تھا کہ قتل عمد میں دو میں سے ایک چیز ہے، قصاص یا دیت، اس بات سے بھی یہ اصحاب علم و نظر ناواقف تھے۔ اس بات کو کون مسلمان تسلیم کرے گا۔ یہ حضرات خیارات کا درجہ رکھتے تھے۔ ان صلحاء پر یہ اتہام رکھنے کے بجائے کہ وہ قتل عمد میں معافی کو جائز سمجھتے تھے، زیادہ بہتر ہے کہ ہم یہ مان لیں کہ ان کی طرف منقول اقوال درست نہیں ہیں۔ ہم ایک لمحہ کے لیے بھی تصور نہیں کر سکتے کہ اصحاب رسولؐ اور ان کے تربیت یافتہ اصحاب علم یعنی تابعین قرآن اور سنت کے ایک منصوص حکم میں اضافہ کر سکتے ہیں۔

مسائلِ اربعہ: اپنے مضمون کے آخر میں جناب بدر احمد مجیبی صاحب نے ائمہ اربعہ کا مسلک بیان کیا ہے۔ جہاں تک فقہ مالکی کا تعلق ہے اس میں جس عفو کا ذکر ہے اس کا تعلق اس مجروح شخص سے ہے جو مرنے سے پہلے قاتل کو معاف کر دینے کی وصیت کر دے (دیکھیں، موطا، باب العفو عن قتل العمد)۔ اس سلسلے میں علامہ ابن عبدالبر قرطبی مالکی لکھتے ہیں:

ومن عفا عن جرح جرحه ثم مات  
وقال ان مت من هذا الجرح فقد  
عفوت صح عفوه ولم يتبع  
الجاني بشيئى ، هذا هو المشهور  
عن مالك - (۱۳)  
جس شخص نے اس جراحت کو معاف کر دیا جو  
اسے لگائی گئی تھی اور کہا کہ اگر اس جراحت کی  
وجہ سے میری وفات ہو جائے تو میں نے اسے  
(یعنی جرح کو) معاف کر دیا تو اس کا معاف  
کرنا (از روئے شریعت) صحیح ہوگا اور قاتل  
سے کسی چیز کا مطالبہ نہیں کیا جائے گا۔ امام  
مالک کا یہ معروف مسلک ہے۔

مزید برآں اصحاب ظاہر کا مشہور اور معمول بہ مسلک یہ ہے کہ قتل عمد میں دو چیزوں میں سے ایک واجب ہوتی ہے، قصاص یا دیت۔ (۱۴)

فقہ حنفی، فقہ شافعی اور فقہ حنبلی کا معاملہ اس سے مختلف ہے۔ ان مسالک میں قصاص اور دیت کے علاوہ معافی بھی ہے۔ ہمارے دل میں امام ابو حنیفہؒ (م ۱۵۰ھ)، امام شافعیؒ (م

۲۰۴ھ) اور امام احمد بن حنبلؒ (م ۲۴۱ھ) کا بڑا احترام ہے اور ان کے علم و آگہی کا بھرپور اعتراف بھی لیکن وہ بہر حال معصوم عن الخطا نہیں تھے۔ راقم یہ بات سمجھنے سے قاصر ہے کہ ان اصحاب علم نے قتل عمد سے متعلق سورہ بقرہ کی آیات اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مکی خطبہ کے باوجود جس کا ذکر صحاح ستہ اور حدیث کی دوسری کتابوں میں ہے، کیوں کر یہ بات لکھ دی کہ قتل عمد میں ولی مقتول کو قصاص اور دیت کے علاوہ معاف کرنے کا بھی اختیار حاصل ہے۔ اس لیے ماننا ہوگا کہ ان مسالک ثلاثہ میں معافی کی بات از قبیل تاویل ہے، جیسا کہ سورہ اسراء (آیت ۳۳) میں لفظ 'سلطان' اور سورہ شوریٰ (آیت ۴۰) میں لفظ 'سیئة' کی تاویلات سے بالکل واضح ہے اور ان کا ذکر اس سے پہلے ہو چکا ہے۔ یہ بات ہر حال میں ملحوظ رہے کہ نصوص قرآن کی وہی تاویل صحیح سمجھی جائے گی جو سیاق کلام اور نظائر قرآن سے معنوی مطابقت رکھتی ہو۔

اہل علم جانتے ہیں کہ فقہ حنفی کا بڑا حصہ قیاسی احکام پر مشتمل ہے۔ راقم کے خیال میں حنفی علماء و فقہاء نے احادیث سے کم ہی رجوع کیا ہے۔ انہوں نے صحیح حدیث کی موجودگی میں قیاس کو ترجیح دی ہے۔ اس کی ایک مثال وجوب زکوٰۃ ہے۔ اس سلسلے میں درج ذیل حدیث قابل ذکر ہے:

”حضرت ابوسعید خدریؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ

وسلم نے فرمایا: پانچ اونٹ سے کم میں زکوٰۃ نہیں، پانچ اوقیہ (چاندی) سے کم

میں زکوٰۃ نہیں اور پانچ وسق (غلہ و پھل) سے کم میں زکوٰۃ نہیں۔“ (۱۵)

موطاء ہی میں ابوسعید خدریؓ سے ایک اور روایت ہے: لیس فیما دون خمسة اوسق من التمر صدقة (باب الزکوٰۃ)۔ صحیح مسلم میں ہے: ولیس فی حب ولا تمر صدقة حتی يبلغ خمسة اوسق ”غلہ اور کھجور میں زکوٰۃ اس وقت واجب ہوتی ہے جب وہ مقدار میں پانچ وسق ہو“۔

لیکن اس واضح ہدایت کے باوجود امام ابوحنیفہؒ نے ہر قسم کی پیداور میں خواہ کم ہو یا زیادہ، زکوٰۃ کو واجب قرار دیا ہے۔ یہی معاملہ دوسرے کئی قیاسی احکام کا ہے جو فقہ حنفی کا جزء ہیں۔

ایک مثال فقہ شافعی سے بھی پیش ہے۔ ایک شخص نے شادی کی لیکن نہ تو عورت کے ساتھ دخول ہوا اور نہ ہی اس کا مہر مقرر کیا گیا اور وہ مر گیا تو وراثت میں اس عورت کو کیا ملے گا؟



امام ابو حنیفہؒ اور امام محمدؒ کہتے ہیں کہ وہ مہر مثل کے ساتھ وراثت میں بھی حقدار ہوگی۔ اور یہ چیز حدیث سے ثابت ہے (جامع ترمذی، ابواب الفرائض، باب: ما جاء فی میراث المرأة من دية زوجها)۔ لیکن امام مالکؒ کی طرح امام شافعیؒ بھی اس حدیث کو صحیح نہیں مانتے کہ وہ مخالف قیاس ہے۔

دین کے مختلف امور و مسائل میں مسالک اربعہ کے درمیان شدید نوعیت کے اختلافات کو دیکھتے ہوئے یہ کہنا مشکل ہے کہ فلاں امام کا مسلک درست ہے۔ ہم کیسے کہہ سکتے ہیں کہ قتل عمد میں معافی کے متعلق امام ابو حنیفہؒ، امام شافعیؒ اور امام حنبلؒ کا مسلک صحیح ہے اور امام مالکؒ کا مسلک جو تعامل اہل مدینہ پر مبنی ہے، غلط ہے اور اصحاب ظاہر بھی غلطی پر ہیں۔

مسلم قوم کا المیہ یہ ہے کہ وہ نظری طور پر قرآن اور اسوۂ رسول کو حق کی کسوٹی مانتی ہے لیکن جب عمل کا وقت آتا ہے تو زیادہ تر نظر قرآن اور اسوۂ رسول کی طرف اٹھنے کے بجائے مسالک اربعہ میں سے کسی ایک مسلک کی طرف اٹھتی ہے اور اسی کو درست مان کر اختیار کر لیتے ہیں گویا کہ وہ وحی الہی ہے۔ جب ان سے کہا جاتا ہے کہ فلاں امام کی فلاں بات اللہ اور اس کے رسول کے فرمان کے مطابق نہیں ہے تو اس مسلک سے وابستہ مسلمان کہتے ہیں کہ کیا اس مسلک کے جید علماء و فقہاء قرآن و سنت کو نہیں سمجھتے تھے؟

یہ کم اندیش لوگ یہ بات بھول جاتے ہیں کہ حاملین تورات بھی اپنی قوم کے عالم لوگ تھے لیکن اس کے باوجود انہوں نے دیدہ و دانستہ توریت کے بہت سے احکام میں تبدیلی کر دی۔ اس کی ایک مثال قتل عمد ہے۔ انہوں نے اس معاملے میں اور اس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے، اللہ کے حکم کو بدل دیا۔ پھر مسلمان اس خوش گمانی میں کیوں مبتلا ہیں کہ ان کے علماء و فقہاء (مستثنیات سے قطع نظر) اس خطا کے مرتکب نہیں ہو سکتے۔

اس بات کا کون منکر ہو سکتا ہے کہ لاکھوں کی تعداد میں جھوٹی حدیثیں گھڑ کر مسلمانوں میں پھیلا دی گئیں اور اہل بدعت اور دنیا پرست علماء انہی جھوٹی حدیثوں کو سنا کر مسلمانوں کو برابر گمراہ کرتے رہتے ہیں۔ حق گو علماء نے اس چیز کا اعتراف کیا ہے کہ بے شمار جھوٹی حدیثیں ہمارے مذہبی لٹریچر کا جز بن چکی ہیں۔ مولانا عبدالحی حسنیؒ لکھتے ہیں:

ان الكتب الفقهية وان كانت معتبرة  
في انفسها بحسب المسائل الفروعية  
وكان مصنفوها ايضاً من المعبرين و  
الفقهاء الكاملين ، لا يعتمد على  
الاحاديث المنقولة فيها اعتمادا كلياً  
ولا بحزم بورودها وثبوتها قطعاً  
بمجرد وقوعها فيها، فكم من  
احاديث ذكرت في الكتب المعبرة

فقہی کتابیں فروعی مسائل کے اعتبار سے اگرچہ  
معتبر ہیں ، ان کے مصنف بھی معتبر اور کامل  
فقہاء میں سے تھے مگر ان میں منقول احادیث  
پر کلی اعتماد نہیں کیا جاسکتا ہے۔ ان کتابوں میں  
کسی حدیث کے درج ہونے سے اس کی صحت  
وثبوت کا یقین نہیں کیا جاسکتا ہے۔ کتنی ہی  
حدیثیں معتبر کتابوں میں مذکور ہیں، حالانکہ وہ  
موضوع ہیں اور ان میں اختلاف پایا جاتا ہے۔

وہی موضوع مختلفہ۔ (۱۷)

امام مسلم نے اپنی ”صحیح“ کے مقدمہ میں یحییٰ بن سعید کا یہ مقولہ نقل کیا ہے ”صالحین کو ہم  
نے حدیث میں زیادہ جھوٹ بولنے والا پایا ہے۔“ ایک قول یہ بھی ہے کہ صوفیہ کسی چیز میں اتنا  
جھوٹ نہیں بولتے جتنا کہ انہوں نے حدیث میں دروغ گوئی کی ہے۔ اس کی توجیہ امام مسلم نے  
یہ کہہ کر کی ہے کہ ”يجري الكذب على لسانهم ولا يعتمدون الكذب“ (ان کی زبان  
سے جھوٹ نکل جاتا ہے، وہ عمداً ایسا نہیں کرتے)۔ امام نوویؒ کی توجیہ بھی ملاحظہ ہو ”وذلك  
لكونهم لا يعانون صناعة اهل الحديث فيقطع الخطاء في روايتهم ولا  
يعرفون ، ويروون الكذب ولا يعلمون انه كذب“ (۱۸) (اہل حدیث کی طرح یہ  
لوگ حدیث کے فن میں محنت نہیں کرتے اس لیے وہ نادانستہ طور پر روایت بیان کرنے میں خطا  
کر جاتے ہیں، وہ جھوٹ روایت کرتے ہیں لیکن اس سے بے خبر ہوتے ہیں کہ یہ جھوٹ ہے)۔  
یہ دروغ گوئی صرف ان احادیث تک محدود نہیں ہے جو اہل تفسیر اور علماء و فقہاء کی  
کتابوں میں درج ہیں یا جن کے راوی صوفیائے کرام ہیں بلکہ حدیث کی معروف کتابوں میں  
بہت سی موضوع روایتیں موجود ہیں۔ ان کا ذکر آگے آ رہا ہے۔

افسوس تو ان علماء کے حال پر ہے جو قرآن و سنت سے براہ راست اخذ و استفادہ کے  
بجائے اسلاف کی اندھی تقلید کرتے ہیں۔ جناب بدر احمد مجیبی کی درج ذیل تحریر جو ان کے مضمون

کا آخری حصہ ہے، ملاحظہ ہو:

”اصل حقیقت یہ ہے کہ قرآن کو خاص کر اس کی آیات احکام کو احادیث نبویہ کے بغیر محض اپنی عقل ناقص کی بنیاد پر سمجھنے کی کوشش کرنے کا یہی نتیجہ برآمد ہوتا ہے۔ (اشارہ ہے راقم کے مراسلے کی طرف)..... شریعت کے احکام کو مجتہدین حضرات نے بھی سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ ان کو اللہ نے اجتہادی شان عطا فرمائی تھی، وہ عربی زبان پر مکمل مہارت، قرآن وحدیث پر پوری نگاہ، صحابہ کرام کے اقوال سے واقفیت، خوف وخشیت الہی اور عبادت میں خشوع و خضوع جیسی نادر صفات کے حامل تھے۔ ان سے اللہ نے احکام شریعت کی تدوین وتحقیق کا کام لیا۔ وہ ہماری موجودہ صلاحیت اور عقل وفہم کے معیار سے بہت بلند تھے۔“ (معارف دسمبر ۲۰۱۲ء، ص ۲۲۲)

کیا قرآن مجید مجمل ہے؟ مذکورہ اقتباس کی پہلی سطر سے تو ظاہر ہوتا ہے کہ جناب بدر احمد نجیبی یہ سمجھتے ہیں کہ قرآن مجمل ہے اور احادیث کے بغیر اس کا سمجھنا ممکن نہیں ہے۔ اس کے معنی تو یہ ہوئے کہ قرآن غیر واضح ہے حالاں کہ خود اسی کتاب میں جگہ جگہ اسے ”کتاب مبین“ کہا گیا ہے یعنی وہ کتاب جس کے مضامین بالکل واضح اور قابل فہم ہیں، اس میں کسی نوع کی ثرولیدگی نہیں ہے (سورہ زمر: ۲۸)۔ قرآن میں تشریف آیات کے ذریعے سے ہر بات کو واضح کر دیا گیا ہے، جیسا کہ ایک جگہ فرمایا ہے:

اَنْظُرْ كَيْفَ نَصَرَفَ الْاٰیٰتِ لَعَلَّهُمْ يَفْقَهُوْنَ (سورہ انعام: ۶۵)

دیکھو! ہم کس طرح آیات کو مختلف پہلوؤں سے بیان کرتے ہیں تاکہ وہ بات سمجھ لیں۔

اسی سورہ میں آگے فرمایا ہے:

قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰیٰتِ لِقَوْمٍ يَّفْقَهُوْنَ (سورہ انعام: ۹۸)

ہم نے آیات کو لوگوں کے لیے کھول کر بیان کر دیا ہے تاکہ وہ بات کو سمجھ لیں۔

یہی معاملہ آیات احکام کا ہے۔ متعدد سورتوں میں آیات احکام کے ذکر کے بعد بالعموم یہ فقرہ ضرور آتا ہے:

كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ  
(مزید دیکھیں سورۃ بقرہ: ۲۴۲، آل عمران: ۱۰۳،

اسی طرح اللہ اپنے احکام کو تمہارے لیے  
وضاحت سے بیان کرتا ہے۔

ماكدہ: ۸۹، سورۃ نور: ۶۱)

یہ صحیح ہے کہ قرآن میں بعض کلی احکام کے جزئیات نہیں بیان کیے گئے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان آیات احکام کا تعلق زمانہ کے احوال و ظروف سے ہے جو برابر بدلتے رہتے ہیں۔ اس لیے اس طرح کے کلی احکام کی تفصیل کا کام نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ذمہ کیا گیا، اور یہ کام آپؐ نے اپنے عہد کے حالات کے لحاظ سے بخوبی انجام دیا۔ انہی تفصیلی احکام کو اصطلاحاً سنت کہا جاتا ہے۔ اس کی ایک مثال حکم زکوٰۃ ہے۔ اس کے مصارف سورہ توبہ میں مقرر کر دیے گئے ہیں لیکن نصاب مقرر نہیں کیا گیا، اسی طرح کے چند کلی احکام کی عدم تفصیل کی بنیاد پر غالباً علماء نے یہ سمجھا کہ قرآن کا سمجھنا حدیث کے بغیر ممکن نہیں ہے۔

قرآن کلام مفصل ہے: کم نظر علماء کی غلط رہنمائی کی وجہ سے بہت سے مسلمان جن میں اہل علم کی ایک بڑی تعداد شامل ہے، سمجھتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے پورے قرآن مجید کی تشریح فرمادی ہے اور وہ حدیث کی کتابوں میں محفوظ ہے۔ لیکن درحقیقت ایسا نہیں ہے۔

حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف چند آیات کی تفسیر بیان فرمائی ہے (۱۹)۔ اگر آپؐ نے پورے قرآن کی تفسیر کر دی ہوتی اور وہ قرآن مجید ہی کی طرح محفوظ شکل میں امت تک منتقل بھی ہو گئی ہوتی تو پھر کسی بحث و اختلاف کی گنجائش کہاں باقی رہتی۔ جملہ اہل ایمان اس کو حرز جاں بنا لیتے اور وہی ایک چیز سب کے لیے مشعل ہدایت کا کام دیتی۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ نبی اکرمؐ نے اس قدر اہم دینی کام سے صرف نظر کیوں کیا؟

غور سے کام لیں تو وجہ بالکل واضح ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کی تفسیر اس وجہ سے بیان نہیں کی کہ قرآن اپنے مفہوم و مدعا میں بالکل واضح ہے اور جہاں اجمال ہے اس کی تفصیل خود اللہ تعالیٰ نے دوسرے مقام پر کر دی ہے۔ قرآن کی متعدد آیات سے ہمارے اس خیال کی تائید ہوتی ہے۔ بطور مثال چند آیات ملاحظہ فرمائیں:

۱۔ الرّٰكِبُ اُحْكِمْتُ اِيْتُهُ ثُمَّ الرّٰی، یہ ایک ایسی کتاب ہے جس کی آیات (باعتبار

معانی و دلائل) محکم کی گئی ہیں پھر حکیم و خیر خدا کی جانب سے اس کی تفصیل کی گئی ہے۔

فُصِّلَتْ مِنْ لَدُنْ حَكِيمٍ خَبِيرٍ  
(سورہ ہود: ۱)

اور یہ لوگ کیا ہی عجیب سوال تمہارے سامنے پیش کریں لیکن ہم اس کا مطابق حق اور نہایت واضح جواب تم کو عنایت کر دیتے ہیں۔

۲- وَلَا يَأْتُوكَ بِمَثَلٍ إِلَّا جِئْنَاكَ بِالْحَقِّ وَأَحْسَنَ تَفْسِيرًا  
(سورہ الفرقان: ۳۳)

کیا میں اللہ کے سوا کسی اور کو فیصلہ کرنے والا بناؤں؟ اور وہی ہے جس نے تمہاری طرف کتاب بھیج دی ہے جو پوری طرح مفصل ہے۔

۳- أَفَغَيْرَ اللَّهِ أَبْتَغِي حَكْمًا وَهُوَ الَّذِي أَنْزَلَ إِلَيْكُمُ الْكِتَابَ مُفَصَّلًا  
(سورہ انعام: ۱۱۴)

اور ہم نے ان تک ایسی کتاب پہنچادی ہے جس کو ہم نے اپنے علم سے نہایت واضح اور مفصل بنایا ہے اور وہ ہدایت اور رحمت ہے ان لوگوں کے لیے جو ایمان لاتے ہیں۔

۴- وَلَقَدْ جِئْنَهُمْ بِكِتَابٍ فَصَّلْنَاهُ عَلَىٰ عِلْمٍ هُدًى وَرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ  
(سورہ اعراف: ۵۲)

آیات مذکورہ میں دو لفظ خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں، ایک تفصیل اور دوسرا تفسیر۔ یہ الفاظ بتاتے ہیں کہ آخری کتاب کے معنی و مفہوم کی وضاحت خود نازل کتاب نے کر دی ہے۔ اس لیے ماننا ہوگا کہ وہ ایک مفصل اور مشرح کتاب ہے، اس کا مفہوم و مدعا بالکل واضح ہے، اس میں کہیں کوئی اشکال اور معنوی خفا نہیں ہے۔ اگر کسی مقام پر کوئی بات مجمل ہے تو دوسری جگہ وہ مفصل کر دی گئی ہے۔

یہ ساری تفصیل و شرح دراصل اس وعدہ کے مطابق ہے جس کا ذکر سورہ قیامہ میں ان الفاظ میں آیا ہے: ثُمَّ إِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهُ (آیت ۱۹) ”پھر ہمارے ہی ذمہ ہے اس کی تفصیل“۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید میں تبیین کی نسبت تقریباً ہر جگہ اللہ تعالیٰ کی طرف کی گئی ہے۔ مثلاً:

اسی طرح اللہ تمہارے لیے اپنی آیات کی وضاحت کرتا ہے تاکہ تم عقل سے کام لو۔

۱- كَذَلِكَ يُبَيِّنُ اللَّهُ لَكُمْ آيَاتِهِ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ (سورہ بقرہ: ۲۲۲)

اللہ چاہتا ہے کہ تمہارے سامنے (اپنے احکام)

۲- يُرِيدُ اللَّهُ لِيُبَيِّنَ لَكُمْ وَ

يَهْدِيكُمْ سُنَنَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ  
(سورہ نساء: ۲۶)

بالکل واضح کر دے اور تم کو ان (صالح) لوگوں کے طریقوں پر چلائے جو تم سے پہلے گزر چکے ہیں۔

۳- وَمَا كَانَ اللَّهُ لِيُضِلَّ قَوْمًا بَعْدَ إِذْ هَدَاهُمْ حَتَّى يُبَيِّنَ لَهُمْ مَا يَتَّقُونَ  
(سورہ توبہ: ۱۱۵)

اللہ کا یہ کام نہیں کہ وہ کسی قوم کو ہدایت دینے اور اس پر راہ تقویٰ واضح کر دینے کے بعد گمراہ کر دے۔

۴- يُبَيِّنُ اللَّهُ لَكُمْ أَنْ تَضِلُّوا وَاللَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ  
(سورہ نساء: ۱۷۶)

اللہ تمہارے لیے (اپنے احکام کی) توضیح کرتا ہے کہ مبادا تم گمراہ ہو جاؤ اور اللہ ہر چیز سے واقف ہے۔

۵- وَيُبينُ آيَاتِهِ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُونَ  
(سورہ بقرہ: ۲۲۱)

اور وہ اپنی آیات کو لوگوں کے لیے وضاحت کے ساتھ بیان کرتا ہے تاکہ وہ نصیحت قبول کریں۔

اس بحث سے واضح ہو گیا کہ اللہ نے اپنی آخری کتاب کی تبیین و تشریح خود کر دی ہے۔ اس کام کو اس نے کسی اور کے سپرد نہیں کیا ہے کہ اس سے اختلاف فکر و عمل کے واقع ہونے کا اندیشہ تھا۔ علماء کا کام قرآن کی تفسیر و توضیح کرنا نہیں جیسا کہ انہوں نے سمجھ رکھا ہے بلکہ اللہ نے تصرف آیات کے ذریعہ کلیات دین کی جو وضاحت کر دی ہے اس کو ٹھیک طرح سے سمجھنا اور پھر اس سے بندگان خدا کو آگاہ کرنا ہے۔

قرآن مجید میں صرف ایک مقام پر تبیین کی نسبت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کی گئی ہے۔ فرمایا ہے:

وَأَنْزَلْنَا إِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ  
مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ  
(سورہ نحل: ۴۴)

اور ہم نے تمہاری طرف ذکر (قرآن) نازل کیا تاکہ جو چیز ان کی طرف نازل کی گئی ہے تم اس کو جوں کا توں ان سے بیان کر دو۔

اس آیت سے علمائے کرام نے اس بات پر استدلال کیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ذمہ یہ کام تھا کہ وہ قرآن کی تشریح و تفسیر فرمادیں۔ اس خیال کی غلطی اس بات سے ظاہر ہو جاتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جیسا کہ اس سے پہلے ذکر ہو چکا ہے، چند ہی آیات کی تفسیر

مروی ہے۔ اگر علمائے کرام کی بات درست تسلیم کر لی جائے تو پھر ماننا ہوگا کہ آپؐ نے اس اہم فریضہ نبوت سے چشم پوشی کی۔ اور اس بات کو کوئی مسلمان بقید ہوش و حواس ہرگز تسلیم نہ کرے گا۔ اس غلطی کی اصل وجہ مذکورہ آیت میں لفظ 'تیمین' کی غلط تشریح ہے۔ تیمین کے ایک معنی بے کم و کاست بیان کرنے کے ہیں اور یہ کتمان کی ضد ہے۔ مثلاً ایک جگہ فرمایا گیا ہے:

يَا أَهْلَ الْكِتَابِ قَدْ جَاءَكُمْ رَسُولُنَا  
يُبَيِّنُ لَكُمْ كَثِيرًا مِمَّا كُنْتُمْ تُخْفُونَ  
مِنَ الْكِتَابِ وَيَعْفُو عَنْ كَثِيرٍ  
(سورہ مائدہ: ۱۵)

صرف نظر کر جاتا ہے جن کو تم چھپاتے ہو۔

دوسری جگہ ارشاد ہوا ہے:

إِنَّ الَّذِينَ يَكْتُمُونَ مَا أَنْزَلْنَا  
مِنَ الْبَيِّنَاتِ وَالْهُدَىٰ مِنْ بَعْدِ مَا  
بَيَّنَّاهُ لِلنَّاسِ فِي الْكِتَابِ أُولَٰئِكَ  
يَلْعَنُهُمُ اللَّهُ وَيَلْعَنُهُمُ اللَّعِينُونَ  
إِلَّا الَّذِينَ تَابُوا وَأَصْلَحُوا وَبَيَّنُّوا  
فَأُولَٰئِكَ أَتُوبُ عَلَيْهِمْ  
(سورہ بقرہ: ۱۵۹-۱۶۰)

جو لوگ چھپاتے ہیں ان باتوں کو جن کا تعلق دلائل واضحہ اور (امور) ہدایت سے ہے جب کہ ہم ان کو کتاب (یعنی تورات) میں لوگوں کے لیے پوری وضاحت کے ساتھ بیان کر چکے ہیں۔ ایسے لوگوں پر اللہ لعنت کرتا ہے اور دوسرے لعنت کرنے والے بھی لعنت کرتے ہیں مگر جو لوگ توبہ کر لیں اور اپنی اصلاح کر لیں اور ان باتوں کو لوگوں کے سامنے بیان کریں (جن کو وہ اب تک چھپاتے رہے ہیں) تو میں ایسے لوگوں کی توبہ قبول کروں گا۔

تیمین کے دوسرے معنی توضیح کے ہیں یعنی کلام کو اس طرح بیان کرنا کہ منشاء کلام بالکل واضح ہو جائے کہیں کوئی اشکال یا ابہام باقی نہ رہے۔ سورہ بقرہ میں جہاں گائے کی قربانی کا ذکر ہے وہاں یہ لفظ اسی معنی میں استعمال ہوا ہے:

قَالُوا اذْءُ لَنَا رَبِّكَ يُبَيِّنُ لَنَا مَا هِيَ  
انہوں نے (موئیؑ سے) کہا کہ آپ اپنے رب



(سورہ بقرہ: ۶۸)

سے درخواست کریں کہ وہ ہم کو واضح بتائے کہ

اس کا رنگ کیسا ہو؟

اسی معنی میں ایک دوسری جگہ آیا ہے:

وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُولٍ إِلَّا

بِلِسَانٍ قَوْمِهِ لِيُبَيِّنَ لَهُمْ

(سورہ ابراہیم: ۴)

پوری وضاحت کے ساتھ بیان کر دے۔

لفظ ’تبیین‘ کی اس تشریح کی روشنی میں غور کریں اور آیت کے سیاق و سباق کو بھی پیش نظر رکھیں تو معلوم ہوگا کہ سورہ نحل میں یہ لفظ اول الذکر معنی میں استعمال ہوا ہے یعنی وحی کو بے کم و کاست بیان کرنا تا کہ مخاطب قوم اس کو پوری طرح سمجھ لے۔ اس لیے اس آیت سے اس بات پر استدلال کرنا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ذمہ پورے قرآن کی تبیین تھی صحیح نہ ہوگا کیونکہ امہات دین کی تبیین خود اللہ نے کر دی ہے جیسا کہ اس سے پہلے بیان ہوا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ذمہ صرف احکام مجمل کی عملی تبیین تھی۔

اس اصول کی روشنی میں غور کریں تو یہ بات باسانی سمجھ میں آجائے گی کہ صحاح ستہ کے تفسیری ابواب میں مرفوع احادیث کی تعداد کم کیوں ہے، اور یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ صحابہ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے معدودے چند ہی سوالات کیوں کیے؟ اس کی وجہ جیسا کہ ابن خلدون نے لکھا (۲۰) ہے، یہ ہے کہ قرآن مجید انہی کی زبان اور اسلوب اور انہی کے احوال و ظروف کے مطابق نازل ہوا تھا اس لیے اس کے معنی و مفہوم اور اس کے اطلاقات کو سمجھنے میں کوئی قابل ذکر دشواری حائل نہ تھی۔ اس کے علاوہ صحابہ کی ساری دلچسپی عملی مسائل سے تھی، نظری مسائل بالخصوص آیات متشابہات میں غور و خوض سے وہ مکمل طور پر اجتناب کرتے تھے۔

کسی شخص نے حضرت ابن عباسؓ سے ”یوم کان مقدارہ خمسين الف سنة“ میں ”یوم“ کے بارے میں پوچھا تو فرمایا: فما یوم کان مقدارہ خمسين الف سنة، ”جو دن بھی ہو اس کی مقدار پچاس ہزار سال ہے“۔ سائل نے کہا کہ میں نے اس کا مطلب دریافت کیا ہے۔ فرمایا: هما یومان ذکرهما اللہ فی کتابہ، واللہ اعلم بہما (۲۱)



”یہ دو دن ہیں جن کا ذکر اللہ نے اپنی کتاب میں کیا ہے اور اللہ ہی ان کو بہتر طور پر جانتا ہے۔“  
امام طبری نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے: فکره ان يقول في كتاب الله  
مالا يعلم (۲۲) ”انہوں نے اس بات کو ناپسند کیا کہ اللہ کی کتاب کے بارے میں وہ بات  
کہیں جس کا انہیں علم نہیں تھا۔“ طبری نے حضرت ابن عباسؓ ہی کے بارے میں ایک دوسری  
روایت نقل کی ہے کہ:

ان ابن عباس سئل عن آیت ، لو  
سئل عنها بعضکم یقال فیہا ،  
فابی ان یقول فیہا۔ (۲۳)  
ابن عباس سے کسی آیت کے بارے میں پوچھا  
جاتا..... اگر تم میں سے کسی سے پوچھا جاتا تو اس  
کے متعلق اپنی رائے ضرور ظاہر کر دیتا..... تو اس  
کے متعلق کچھ کہنے سے انکار کر دیتے۔

سعید بن مسیب کے بارے میں روایت ہے کہ: انه كان لا يتكلم الا في  
المعلوم من القرآن (۲۴) ”قرآن کی جو باتیں ان کو معلوم ہوتیں وہ صرف انہی کے متعلق  
گفتگو کرتے تھے۔“ انہی تابعی کے بارے میں ایک دوسری روایت ہے: انه كان اذا سئل  
عن تفسير آية من القرآن قال : انا لا نقول في القرآن شيئا (۲۵) ”ان سے جب  
قرآن کی کسی آیت کی تفسیر پوچھی جاتی تو کہتے کہ ہم قرآن کے متعلق کچھ نہیں کہیں گے۔“  
صحابہ صرف آیات احکام کے متعلق گفتگو کرنا پسند کرتے تھے۔ چنانچہ تابعی مذکور کے  
بارے میں روایت ہے کہ جب ان سے حلال و حرام کے متعلق پوچھا جاتا تو وہ اس کو بتا دیتے  
لیکن کسی آیت کی تفسیر پوچھی جاتی تو وہ اس طرح خاموش رہتے گویا سنا ہی نہیں۔ روایت کے  
الفاظ ہیں:

كان نسئل سعيد بن المسيب عن الحلال والحرام ، وكان اعلم  
الناس ، فاذا سئلناه عن تفسير آية من القرآن سكت كان لم يسمع۔ (۲۶)  
تفسیر قرآن کے باب میں صحابہ اور تابعین کے اس طرز عمل کے پیش نظر کون کہہ سکتا  
ہے کہ قرآن کی تفسیر، احادیث سے کرنا صحیح ہوگا۔ حقیقت یہ ہے کہ کتب حدیث کے ابواب التفسیر  
میں مرفوع اور موقوف دونوں طرح کی روایتیں شامل ہیں۔ ان میں ضعیف روایتیں بھی موجود

ہیں، مثلاً 'تسع آیات'، (بنی اسرائیل: ۱۰۱) کو لیں۔ قرآن کی تصریح کے مطابق 'تسع آیات' سے یہ چیزیں مراد ہیں: عصا، ید بیضاء، قحط، نقص ثمر، طوفان، مڈی، جوں، مینڈک، خون (دیکھیں سورۃ اعراف: ۱۰۷، ۱۳۰، ۱۳۳)۔ لیکن ترمذی، مسند احمد، نسائی اور ابن ماجہ کی حدیث کے مطابق نو نشانیاں یہ تھیں: خدا کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرنا، زنا نہ کرنا، کسی بے گناہ کو قتل نہ کرنا، چوری نہ کرنا، حاکم کے پاس کسی معصوم کی چغلی نہ کھانا، سود نہ کھانا، پاک دامن عورت پر تہمت نہ لگانا، میدان جہاد سے نہ بھاگنا، سبت کے دن زیادتی نہ کرنا۔ (یہ دراصل تورات کے احکام عشرہ ہیں) ان احکام کو سن کر وہ یہودی جو آپ سے 'تسع آیات' کا مطلب دریافت کرنے آئے تھے نہایت خوش ہوئے اور آپ کے دست و پا کو بوسہ دیا۔ (۲۷)

بعض روایتیں نص قرآن سے متعارض ہیں، مثلاً آیۃ تطہیر (احزاب: ۳۳) سے متعلق حدیث۔ حضرت ابراہیمؑ کے جھوٹ بولنے کا قصہ بھی (صحیح بخاری) اسی زمرہ سے تعلق رکھتا ہے۔ "وعلیہن درجۃ" (بقرہ: ۲۲۸) سے متعلق حدیث بھی صریحاً نص قرآن سے متعارض ہے۔ روایت ہے کہ ایک عورت نے آنحضورؐ سے شکایت کی کہ اس کے شوہر نے اسے ایسا طمانچہ مارا ہے جس سے اس کے چہرے پر نشان پڑ گیا ہے۔ آپؐ نے فرمایا کہ اسے اس کا حق حاصل نہیں ہے۔ اس وقت یہ آیت نازل ہوئی: "الرجال قوا امون....." گویا حدیث کے مطابق اس آیت نے مرد کو اختیار دے دیا کہ وہ قوام ہونے کی بنا پر عورت کو شدید طور پر مارنے کا حق رکھتا ہے۔ (۲۸) (استغفر اللہ)

جہاں تک کتب تفسیر میں مندرج روایات کا معاملہ ہے تو ان کے متعلق امام احمد بن حنبلؒ کا یہ فیصلہ ہے: "ثلاثة امور ليس لها اسناد، التفسير والملاحم والمغازي"۔ (۲۹) "تین چیزوں کا اعتبار نہیں، ایک تفسیر، دوسرے ملاحم اور تیسرے مغازی"۔ اس سلسلے میں امام ابن تیمیہؒ کی رائے بھی ملاحظہ فرمائیں: "والموضوعات في كتب التفسير كثيرة"۔ (۳۰) "کتب تفسیر میں موضوع روایتوں کی کثرت ہے"۔

متذکرہ بالا حقائق کے باوجود تقلیدی ذہن کے علماء کہتے ہیں کہ صحاح ستہ بالخصوص صحیحین کے غیر تفسیری ابواب کی حدیثوں پر اس رائے کا اطلاق نہ ہوگا۔ ان کا یہ خیال صحیح نہیں

ہے۔ صحاح ستہ کی احادیث کا بڑا حصہ جس میں صحیحین کی احادیث بھی شامل ہیں، اخبار آحاد پر مشتمل ہے اور تمام محقق علماء کے نزدیک، محدثین کو مستثنیٰ کر کے، اخبار آحاد مفید یقین نہیں یعنی ان سے علم یقین حاصل نہیں ہوتا بلکہ صرف گمان غالب حاصل ہوتا ہے۔ اس کے برخلاف قرآن مجید قطعی الدلالت ہے یعنی وہ یقینی ذریعہ علم ہے اس لیے قطعی الدلالت کی تفسیر ظنی الدلالت چیز سے نہیں کی جاسکتی ہے۔ جو لوگ حدیث کو کسی طور پر مفید یقین خیال کرتے ہیں وہ بھی یہ نہیں کہتے کہ قرآن اور صحیحین میں مذکور احادیث باعتبار یقین یکساں درجہ رکھتی ہیں۔ اس لیے محفوظ طریقہ یہ ہے کہ حتی الامکان قرآن کی تفسیر قرآن سے کی جائے۔

علامہ ابن کثیرؒ نے اپنی تفسیر کے مقدمہ میں لکھا ہے کہ: فان قال قائل، فما احسن طريق التفسير (فالجواب) ان اصح الطريق في ذلك ان يفسر القرآن بالقرآن (۳۱)۔ ”اگر کوئی پوچھے کہ تفسیر کا سب سے عمدہ طریقہ کیا ہے؟ (تو اس کا جواب یہ ہے کہ) قرآن کی تفسیر قرآن سے کی جائے۔“

احادیث کی ظہنیت اور موضوعیت کے علاوہ جس کا اوپر ذکر ہوا، بہت سی احادیث میں اختلاف و تناقض پایا جاتا ہے اور یہ چیز بھی ان کے اعتبار و استناد کو مجروح کرتی ہے۔ اس سلسلے میں ایک دو مثالیں کافی ہوں گی۔ حضرت عائشہؓ سے مروی ایک روایت میں ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے معراج کے موقع پر اللہ کے بجائے جبریل علیہ السلام کو ان کی خلقی صورت میں دیکھا تھا (صحیح بخاری، کتاب التفسیر، صحیح مسلم، کتاب الایمان)۔ لیکن صحیح بخاری (کتاب التوحید) میں ایک دوسری روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے رب کو دیکھا تھا۔ ترمذی اور نسائی میں حضرت عبداللہ ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے معراج میں رب تعالیٰ کو دیکھا تھا۔

اسی طرح صحیح بخاری میں ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کے موقع پر فرمایا: يا ايها الناس اني قد تركت فيكم ما لن تضلوا بعده ان اعتصمتم به : كتاب الله۔ ”اے لوگو! میں نے تم میں وہ چیز چھوڑی ہے کہ اگر اس کو مضبوطی سے پکڑے رہو گے تو ہرگز گمراہ نہ ہوگی، اور وہ چیز کتاب اللہ (یعنی قرآن) ہے۔“

لیکن موطا کی ایک روایت میں کتاب اللہ کے ساتھ ”سنٹی“ کے الفاظ ہیں۔ (۳۲) ایک اور مجموعہ حدیث المعجم الکبیر (طبرانی) میں ”سنٹی“ کے بجائے ”عترتی“ ہے یعنی اہل بیت۔ (۳۳) غرض یہ کہ کسی بھی دینی مسئلہ کے متعلق کوئی روایت دیکھ لیں اس کے بالمقابل ایک دوسری حدیث ضرور موجود ملے گی جو اس کی نقیض ہوگی۔ مثلاً ایک حدیث میں ہے کہ ”ریشم اور سونا کا استعمال مردوں کے لیے حرام اور عورتوں کے لیے حلال ہے۔ (ترمذی، باب ما جاء فی الحریر والذهب)۔ لیکن ایک دوسری حدیث میں عورتوں کے لیے سونے کے زیورات کے استعمال کی ممانعت آئی ہے۔ (المعجم الکبیر، طبرانی، مزید دیکھیں مسند احمد، رقم الحدیث ۲۳۱۲۲) حدیثوں کے اس اختلاف و تناقض اور ان کے ظنی ہونے کی وجہ سے ہی امام ابو حنیفہؒ اور دوسرے خفی علماء نے احادیث یعنی اخبار آحاد کو ناقابل اعتبار قرار دے کر رد کر دیا۔ شیخ محمد ابوزہرہ لکھتے ہیں:

والحق اننا اذا استشنا الشافعی و  
احمد بن حنبل و فقهاء الظاهر  
الذين جاءوا من بعده ، نجد الفقهاء  
جميعا من لدن عصر الصحابة الى  
آخر عصر الاجتهاد قد تركوا  
اخبار الاحاد وردوا نسبتها الى  
رسول الله صلوات الله وسلامه  
عليه لمخالفتها لاصول ثابتة لديهم  
قد اخذوا بالاستنباط من القرآن او  
المشهور من الآثار - (۳۴)

آگے انہوں نے مزید لکھا ہے:

فهم ياخذون بدلالات القرآن  
ومفهوم عباراته و اشاراته  
وہ قرآن کی دلائلوں، اس کی عبارات کے مفہوم  
اور اس کے اشارات کو لیتے ہیں اور اس صورت

وینتر کون الاحادیث عند ذلک  
احتیاطاً فی قبول الروایة  
وترجیحاً لنص قرآنی لا شک  
فی صدقه علی روایة حدیث  
محممل الصدق۔ (۳۵)  
کذب کا بھی امکان پایا جاتا ہے۔

امام سرحسیؒ نے تو یہاں تک لکھ دیا ہے کہ اخبار آحاد سے جو احکام مستنبط ہوتے ہیں وہ فرض ہوتے ہیں اور نہ واجب اور نہ ہی ان کا تارک مستوجب سزا ہے۔ (لا یعاقب بترکھا  
لانھا لیست بفریضة ولا واجبة)۔ (۳۶)

اس مقام پر یہ بات قابل ذکر ہے کہ جس رسول خدا کی طرف اخبار آحاد (احادیث)  
کو منسوب کیا گیا ہے، خود اس ہادی برحق نے فرمایا ہے: من کتب عنی غیر القرآن شیئاً  
فلیمحہ (صحیح مسلم) ”جس نے قرآن کے سوا میری کوئی بات لکھی ہے تو چاہیے کہ اس کو مٹا  
دے۔“ ترمذی میں ہے: لا تکتبوا عنی غیر القرآن شیئاً ”قرآن کے سوا کوئی چیز مجھ سے  
سن کر نہ لکھو۔“ صرف انہی معدودے چند حدیثوں کے لکھنے کی اجازت دی گئی جن کا تعلق زکوٰۃ  
وغیرہ کے احکام سے تھا۔ مشہور صحیفہ علیؑ میں احکام صدقہ کی تفصیل درج تھی۔ (۳۷)

اس ممانعت کے باوجود کچھ اصحاب نے حدیثوں کو اپنے الفاظ میں لکھا لیا تھا۔ تحریری  
طور پر الفاظ رسول کے محفوظ نہ ہونے کی وجہ سے عہد صحابہ میں ہی اختلاف شروع ہو گیا تھا۔ اس  
اختلاف کو دیکھ کر حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اپنے عہد خلافت میں صحابہ کو مشورہ دیا کہ:

لا تحدثوا عن رسول اللہ شیئاً ، تم رسول اللہ سے منسوب کوئی بات بیان نہ کرو۔  
فمن سألکم فقولوا بیننا وبينکم تم سے اگر کوئی پوچھے تو کہہ دو ہمارے اور تمہارے  
کتاب اللہ (۳۸)۔ درمیان کتاب اللہ ہے (یعنی وہی کافی ہے)۔

بیان روایت میں صحابہ کے اسی اختلاف کو دیکھ کر حضرت عمر فاروقؓ نے اپنے دور  
خلافت میں حدیث کے مجموعے جلوادے تھے اور صحابہ کی مجلس میں ارشاد فرمایا: وانی واللہ لا  
اشوب کتاب اللہ بشئی ابدا (۳۹)۔ ”اور قسم ہے اللہ کی، میں اللہ کی کتاب کو کسی دوسری

چیز کے ساتھ ہرگز مخلوط نہ ہونے دوں گا۔“ اس سے کوئی یہ نہ سمجھے کہ خلیفہ دوم صرف اس بات کے خلاف تھے کہ حدیثوں کو لکھا جائے۔ وہ جہاں ان کی تسوید کے خلاف تھے وہاں زبانی بیان کرنے کو بھی ناپسند کرتے تھے۔ اس معاملے میں دورانِ اندیش خلیفہ راشد کی سختی کا حال یہ تھا کہ انہوں نے کثرت سے حدیثیں بیان کرنے والے تین جلیل القدر اصحاب رسول، ابن مسعودؓ، ابن ابی درداءؓ اور ابو مسعودؓ کو قید کر دیا تھا۔ (۴۰)

خلیفہ اول نے یہ کیوں فرمایا کہ ”اللہ کی کتاب ہمارے اور تمہارے درمیان (فیصلہ کے لیے کافی) ہے۔“ اس سے بھی بڑا سوال یہ ہے کہ خلیفہ دوم نے حدیث کے مجموعے کیوں جلوا دیے؟ اور وہ کیوں اصحاب رسول کو حدیثیں بیان کرنے سے روکتے تھے؟ اگر خلیفہ دوم کے ان اقدامات پر سنجیدگی سے غور کیا جائے تو فکری خطا کا احساس ہو جائے گا۔ اس سے بڑا المیہ اور کیا ہوگا کہ دو جلیل القدر خلفاء رسول نے اس امت کو جس فتنے کے گڑھے میں گرنے سے بچانے کے لیے ہر طرح کی تدبیر کی وہ بالآخر اس میں جا گری۔

”حقیقت“ کا نام نور اور فرقان یعنی قرآن مجید ہے جس سے امت کے سوا عظیم کافر کی اور عملی رشتہ علماء سو کی غلط رہنمائی کی وجہ سے تقریباً ٹوٹ چکا ہے اور اس انجام سے دوچار ہے جس کی خبر رسول برحق صلی اللہ علیہ وسلم بہت پہلے دے چکے ہیں۔ ابوسعید خدریؓ روایت کرتے ہیں کہ:

”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم لوگ ضرور گزشتہ لوگوں کے نقش قدم پر چلو گے، بالشت بالشت اور ہاتھ ہاتھ، حتیٰ کہ اگر وہ کسی گاوہ کے بل میں گھسے ہوں تب بھی تم ان کی پیروی کرو گے۔ ہم نے (یعنی صحابہ نے) عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول، کیا اس سے یہود و نصاریٰ مراد ہیں؟ آپؐ نے فرمایا کہ پھر اور کون۔“ (بخاری و مسلم)

خلاصہ بحث: گزشتہ صفحات میں جناب بدر احمد مجیبی صاحب کے مضمون کا جو تفصیلی جائزہ لیا گیا، اس کا خلاصہ درج ذیل ہے:

۱۔ قتلِ عمد میں اصل سزا تو قصاص ہے البتہ شاذ حالات میں دیت بھی لی جاسکتی ہے۔ سورہ بقرہ کی آیات ۸۷ اور ۱۷۹ اس باب میں حجت قطعی کی حیثیت رکھتی ہے۔ جن اصحاب علم نے ولی مقتول کو قصاص اور دیت کے علاوہ معافی کا بھی اختیار دیا ہے ان کی بات اس لیے غلط

ہے کہ یہ نص صریح (آیات بقرہ) کے بالکل خلاف ہے۔ اس سلسلے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام اور تابعین کی طرف جو اقوال منسوب کیے گئے ہیں وہ ناقابل اعتبار ہیں۔ اس باب میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ قول صحیح ہے جس کا تعلق فتح مکہ کے موقع پر دیے گئے خطبے سے ہے۔ اس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے واضح لفظوں میں فرمایا ہے کہ قتل عہد میں ولی مقتول کو دود میں سے ایک چیز کا اختیار ہے، قصاص یا دیت (صحاح ستہ)۔ معافی کا تعلق قتل عہد کے بجائے قتل خطا (سورہ نساء: ۹۲) اور جروح (زخموں) سے ہے (مائدہ: ۴۵)۔

۲۔ قرآن مجید اپنے معنی و مفہوم کے اعتبار سے ایک واضح کلام ہے البتہ اس کے صحیح فہم کے لیے تدبیر لازمی ہے (سورہ ص: ۲۹)۔ اس کے علاوہ سیاق کلام اور نظائر قرآن کی طرف مراجعت ضروری ہے۔ قرآن میں جہاں کہیں اجمال ہے اس کی وضاحت دوسرے مقام پر کردی گئی ہے (سورہ ہود: ۱)۔ دوسرے لفظوں میں قرآن خود اپنا شارح ہے۔ احادیث یعنی اخبار آحاد میں چونکہ صدق و کذب دونوں کا امکان ہے اس لیے تفسیر قرآن میں ان کی طرف مراجعت میں محتاط رہنے کی ضرورت ہے، صرف انہی حدیثوں سے اخذ و استفادہ کیا جائے جو روایت اور راایت کے معینہ اصولوں کے لحاظ سے صحیح ہوں اور ان سے نصوص قرآن کی تائید ہوتی ہے۔

۳۔ نصوص قرآن سے استخراج احکام میں علماء و فقہاء کے درمیان جو اختلاف ہوا، اس کی وجہ اختلاف فہم کے علاوہ وہ اہم بات ہے جس کا ذکر موسوی شریعت سے متعلق علمائے یہود کے اختلاف کے ذیل میں ہوا ہے یعنی 'بغی'۔ (دیکھیں سورہ بقرہ: ۲۱۳، سورہ آل عمران: ۱۹)۔ یہ 'بغی' کیا ہے؟ 'بغی' ان کے ہر عالم کی یہ ضد تھی کہ اس کا علم و فہم دوسرے عالموں سے زیادہ وسیع اور معتبر ہے اور یہ ضد کہ اس کی علمی و مذہبی سیادت کے آگے کسی اور مذہبی پیشوا کی پیشوائی کا چراغ جلنے نہ پائے۔

اللہ ہم سب مسلمانوں بالخصوص طبقہ علماء کو 'بغی' کے فتنے سے محفوظ رکھے۔ (آمین)

حواشی (قسط اول: ۱-۱۲)

(۱) دیکھیں احکام القرآن، ابن العربی مالکی، ج ۵، ص ۲۵۹۔ (۲) تفسیر العیون والکت، امام ابوالحسن علی ماوردی، ج ۳، ص ۲۴۰۔ (۳) تفسیر کبیر (مفتاح الغیب)، امام رازی، ج ۲۰، ص ۳۳۵۔ (۴) موضح فرقان



(شیخ الہندؒ)، سورہ بنی اسرائیل، آیت ۳۳، فائدہ نمبر ۱۱۔ (۵) تدبر قرآن، مولانا امین احسن اصلاحیؒ، ج ۴، ص ۵۰۱۔ (۶) تفسیر جلالین، جلال الدین محلیؒ و جلال الدین سیوطیؒ، تفسیر سورہ شوریٰ۔ (۷) فتح القدر، علامہ شوکانیؒ، ج ۶، ص ۳۸۷۔ (۸) مقدمہ فی اصول التفسیر، امام ابن تیمیہؒ، ص ۹۳۔ (۹) الخیر الکثیر، شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ، ص ۸۷۔ (۱۰) الموافقات فی اصول الشریعہ، امام شاطبیؒ، ج ۴، ص ۱۳۔ (۱۱) التکمیل فی اصول التاویل، علامہ حمید الدین فراہیؒ، ص ۱۵۔ (۱۲) کتاب الدیات، ابن ابی عاصم الشیبانیؒ، ص ۱۰۳۔

حواشی (قسط دوم: ۱۳-۴۰)

(۱۳) الکافی، علامہ ابن عبد البر مالکی، کتاب القصاص والدیات، ج ۲، ص ۱۰۹۹۔ (۱۴) الانصاف، مرداوی، ج ۱۰، ص ۵۔ (۱۵) موطا، امام مالکؒ، کتاب الزکوٰۃ، باب: ماتحب فیہ الزکوٰۃ۔ (۱۶) مسند احمد، امام احمد بن حنبلؒ، ج ۱، ص ۲۶۵ (اخرجہ البیہقی عن ابن عباسؓ)۔ (۱۷) مقدمہ عمدۃ الرعاۃ فی حل شرح الوقایہ، مولانا عبدالحی حسنیؒ، ج ۱، ص ۱۳۔ (۱۸) صحیح مسلم (شرح نووی)، ج ۱، ص ۱۴، ۱۵۔ (۱۹) تفسیر طبری، ج ۱، ص ۲۱، تفسیر القرطبی، ج ۱، ص ۳۱۔ (۲۰) التفسیر والمفسرون، محمد حسین الذہبی، ص ۴۸۹۔ (۲۱) تفسیر ابن کثیر، علامہ ابن کثیر، ج ۱، ص ۶، ۷، مزید دیکھیں: تفسیر طبری، ج ۲۹، ص ۷۲۔ (۲۲) تفسیر طبری، محمد بن جریر طبریؒ، ج ۱، ص ۸۶۔ (۲۳) تفسیر ابن کثیر، علامہ ابن کثیر، ج ۱، ص ۵۔ (۲۴) تفسیر طبری، ج ۱، ص ۸۶۔ (۲۵) ایضاً۔ (۲۶) ایضاً۔ (۲۷) ترمذی، امام ترمذی (تفسیر سورہ بنی اسرائیل)۔ (۲۸) تفسیر مظہری، قاضی ثناء اللہ پانی پتی، ج ۱، ص ۹۸۔ (۲۹) مقدمہ فی اصول التفسیر، امام ابن تیمیہؒ، ص ۵۱۔ (۳۰) ایضاً، ص ۷۷۔ (۳۱) تفسیر ابن کثیر، علامہ ابن کثیر، ج ۱، ص ۳ (مقدمہ)۔ (۳۲) موطا، امام مالکؒ، کتاب القدر، باب: النبی عن القول بالقدر، حدیث نمبر ۳۔ (۳۳) المعجم الکبیر، طبرانی، حدیث نمبر ۲۶۷۸۔ (۳۴) ابو حنیفہ، حیاتہ وعصرہ، شیخ محمد ابو زہرہ، ص ۲۴۸۔ (۳۵) ایضاً، ص ۲۶۱۔ (۳۶) کشف بزدوی (کشف الاسرار)، فخر الاسلام علی بن محمد بزدویؒ، ج ۲، ص ۳۱۰۔ (۳۷) جامع بیان العلم، علامہ ابن عبد البر، ج ۱، ص ۱۱۹۔ (۳۸) تذکرۃ الحفاظ، امام ذہبی، ج ۱، ص ۳۔ (۳۹) جامع بیان العلم، علامہ ابن عبد البر، ج ۱، ص ۶۴۔ (۴۰) تذکرۃ الحفاظ، امام ذہبی، ج ۱، ص ۷۔

نوٹ: اس مضمون کے چند حوالے (حوالہ نمبر ۱، ۲، ۳، ۷، ۱۲، ۱۳، ۱۴) جناب بدر احمد مجیبی صاحب کے مضمون سے ماخوذ ہیں، البتہ عربی عبارات کے ترجمے میں حذف و اضافہ کیا گیا ہے۔ (الطاف)



## علامہ شبلی نعمانیؒ اور ان کے تعلیمی تصورات کی عصری معنویت پروفیسر اختر الواسع

”یہ مقالہ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کے اشتراک سے ہونے والے ”علامہ شبلیؒ یادگاری خطبہ“ کے لیے لکھا گیا جو ۲۳ فروری ۲۰۱۳ء کو دارالمصنفین شبلی اکیڈمی میں پیش کیا گیا۔“ (معارف)

آج کی یہ بزم اسلامی علم و دانش اور فکر و فہم کی تاریخ کے ایک ایسے عبقری اور نادرہ روزگار بطل جلیل کے ذکر کے لیے وقف ہے جس کی یاد آنکھوں میں چراغوں کا ایک طویل سلسلہ اور دل و دماغ میں انوار کی ایک کہکشاں منور کر دیتی ہے۔ علامہ شبلی نعمانی نے انیسویں صدی کے نصف آخر اور بیسویں صدی کی اول ڈیڑھ دہائیوں کے دوران فکر و نظر کی وہ تابندگی پیدا کی جس نے دور زوال کو دور عروج کی بلندیوں کے شانہ بہ شانہ اس سے آنکھیں چار کرنے کی جرأت عطا کی اور عقل انسانی نے دیکھا کہ قوائے عقلی و فکری کے دور انحطاط میں بھی کوئی ذہن اس قدر توانا اور فعال و سرگرم ہو سکتا ہے جو اپنے تخیلات و افکار کو تمام قدیم و جدید علمی فتوحات کا جامع بنا لے۔

لیکن علامہ کے علمی کمالات اور آج کے خاص و منتخب موضوع جو علامہ شبلی کے تعلیمی تصورات اور ان کی عصری معنویت سے متعلق ہے پر کچھ عرض کرنے سے قبل میرا فرض ہے کہ شبلی اکیڈمی کے سربراہ اور اراکین و متعلقین کے لیے اپنے جذبات ممنونیت کا اظہار کروں جنہوں نے مجھ کو علم و ہیچ فہم کو اس بارگراں کا متحمل ہونے کے لائق جانا۔ میرے نزدیک علامہ شبلی کے افکار و افعال کی یادوں

ڈائریکٹر ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی۔

سے منور اس ادارے میں میری موجودگی ایک دریائے تند و تیز میں ایک تنکے کی طرح ہے جو علم و فضل کی روانی کے تصور سے ہی لرزہ بر اندام ہے۔ میری یہ کم مائیگی مجھ پر اس وقت اور بھی واضح و طاہر ہو جاتی ہے جب میں محترم پروفیسر اشتیاق ظلی کی جانب دیکھتا ہوں جنہوں نے شبلی اکیڈمی جیسی ہماری نہایت بیش قیمت علمی میراث کو ایک نیا رنگ و آہنگ اور ایک نئی حرکت و فعالیت دینے میں جو بیش بہا تعمیری کوششیں کی ہیں ہم ان کے احسان مند ہیں۔ پروفیسر ظلی صاحب کئی لحاظ سے اس ادارے کے سربراہ و منتظم ہونے کے منصب جلیلہ کے لیے موزوں ہیں۔ وہ ایک طرف تاریخ کے میدان میں اعلیٰ اختصاص کے حامل ہیں جو علامہ شبلی کی مرکزی و محوری توجہات کا بھی میدان تھا۔ دوسری طرف وہ اپنی مشرقی علمی میراث کے بحرِ خار کے بھی غواص اور اس خزانے کے زرو جواہر کے پارکھ ہیں۔ اس کے علاوہ مغرب کی علمی روایت اور علوم جدیدہ بطور خاص سماجی علوم کی علمیات و طریق فکر پر بھی ان کی گہری نظر ہے۔ اس علمی و فکری توانائی اور درک و فہم کے ساتھ پروفیسر ظلی صاحب نے شبلی اکیڈمی کی تجدید و حیات نو کا جو نقشہ مرتب کیا ہے اس سے توقع ہے کہ یہ ادارہ اپنے عظیم ستونوں علامہ سید سلیمان ندویؒ، مولانا عبدالسلام ندویؒ، شاہ معین الدین ندویؒ، مولانا ریاست علی ندویؒ، مولانا مسعود علی ندویؒ، سید صباح الدین عبدالرحمانؒ، مولانا عبدالسلام قدوائی ندویؒ اور مولانا ضیاء الدین اصلاحیؒ وغیرہم کی علمی و فکری روایت کو ایک نئی زندگی سے ہم کنار کر سکے گا۔

شبلی نعمانی برصغیر ہند میں مسلمانوں کی تہذیبی و علمی نشاۃ ثانیہ کے ایک ایسے نقش جلیل و جلیل ہیں جن سے صرف نظر کر کے ہندوستانی مسلمانوں کی گزشتہ ڈیڑھ سو سالہ تاریخ کی جو بھی شکل پیش کی جائے گی وہ نہ صرف نامکمل اور بے بضاعت ہوگی بلکہ استناد و اعتبار سے بھی محروم ہوگی۔ ہماری تہذیبی تاریخ کی بہت سی اہم شخصیات تنوع اور کثرت الیاد کی حامل رہی ہیں مگر ان میں شبلی کو یہ اختصاص اور انفرادیت حاصل ہے کہ ان کی علمی اور عملی دلچسپیوں اور اظہارات نے ایک ایسی نہایت روشن کہکشاں پیدا کی جس کا ہر ستارہ اپنے آپ میں آفتاب و ماہتاب کا درجہ رکھتا ہے۔ انیسویں صدی تک ہندوستان کے ساتھ ساتھ ساری دنیا میں مسلمانوں کا جو علمی و تعلیمی نظام رائج تھا اس میں دینی و نبوی علوم کی علاحدگی روا نہیں رکھی جاتی تھی بلکہ انسان کی تمام تر ذہنی و علمی سرگرمیوں

کا احاطہ کیا جاتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اگر کوئی شخص فلسفہ کا ماہر ہوتا تھا تو اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ وہ اس میدان کے باہر کی باتوں سے بالکل بے خبر ہے۔ چنانچہ الکندی اور الفارابی جیسے فلسفی، فلسفے کے ساتھ ساتھ نجوم اور موسیقی میں بھی دلچسپی رکھتے تھے اور شعر و ادب پر علمی غور و خوض بھی ان کے دائرہ سر و کار کا حصہ تھا۔ ایسے افراد کی ایک طویل فہرست ہے جو بہ یک وقت دینی علوم کے ساتھ ساتھ تاریخ و جغرافیہ، ہندسہ و نجوم اور شعر و ادب تمام میدانوں میں یکساں مہارت کے حامل تھے۔ شبلی نعمانی اس عظیم علمی و تعلیمی روایت کے فیض یافتہ آخری عالم اور دانشور کہے جاسکتے ہیں۔

ہمہ جہت اور کثیر الابعاد ہونا ایک ایسا وصف ہے جسے انیسویں اور بیسویں صدی کی کئی علمی اور تہذیبی شخصیتوں کا نشان امتیاز کہا جاسکتا ہے مگر یہ وصف جس جس انداز سے شبلی کے ہاں ظاہر ہوا ہے اس کا رنگ ہی کچھ اور ہے۔ انہیں معروف طور پر مورخ اور سیرت نگار اور اس کے ساتھ ہی ایک ادبی نقاد کی حیثیت سے تسلیم کیا جاتا ہے کہ ان میدانوں میں انہوں نے ایسے کارنامے انجام دیے جو اپنی مثال آپ ہو کر رہ گئے۔ الفاروق اور المامون اور ان سب سے بڑھ کر سیرت نبوی پر ان کی ضخیم تالیف ایک عالم سے خراج تحسین وصول کر چکی ہے۔ فارسی شعر و ادب کی تفہیم و تعبیر پر مبنی ان کی معرکہ الآراء تالیف 'شعر العجم' اور اردو ادبی تنقید کے میدان میں 'موازنہ انیس و دہیر' کی انفرادیت اور کلیدی اہمیت سے کسے انکار ہو سکتا ہے۔ 'شعر العجم' نے تو خود اہل ایران کو حیران و ششدر کر دیا تھا اور یہ بات ان کے فہم سے بالاتر تھی کہ ایک ایسا شخص جس نے نہ کبھی ایران کی سر زمین پر قدم رکھا ہو اور نہ اسے فارسی زبان و ادب کا زندہ ماحول نصیب رہا ہو، اسے اہل زبان سے کوسوں دور رہ کر بھی اس زبان کے شعر و ادب کا ایسا گہرا درک کس طرح حاصل ہوا۔ اب اگر کوئی یہ سمجھ لے کہ علامہ شبلی کا ذہن اور اس کی جولانیاں بس اپنے ادبی کارناموں پر تمام ہو گئیں تو اسے سخت حیرت ہوتی ہے، جب وہ دیکھتا ہے کہ اس عبقری کا قلم حدیث و فقہ اور اسلامی قانون کے تہہ در تہہ معارف میں بھی اسی قدر ڈوبا ہوا ہے جتنا عبور اسے اسلامی فلسفہ اور علم کلام پر حاصل ہے۔ اسلامی علوم کے معاملے میں شبلی نعمانی دوسرے بہت سے لوگوں سے اس لحاظ سے بھی مختلف ہیں کہ ان تمام علوم سے ان کی وابستگی بہ یک وقت اور انتہائی جزری تک پہنچی ہوئی تھی اور اس کے ساتھ ہی اس میں ایک خاص طرح کی اجتہادی شان بھی موجود تھی۔ ان خالص علمی امور میں مہارت تامہ حاصل ہونے کے ساتھ ہی شبلی نعمانی کے

عملی سماجی سروکار بھی اپنی ایک الگ شان اور حسن رکھتے ہیں۔ دینی تعلیم کو ایک نیا معنی و مفہوم اور رنگ و آہنگ دینے، اسے عصری تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے اور دینی اور دنیوی علوم کے درمیان خلیج کم کرنے کے لیے کی گئی ان کی جدوجہد جو ندوة العلماء کے ساتھ ان کی وابستگی کے زمانے میں ظاہر ہوئی ان کی شخصیت کا ایک ایسا پہلو ہے جس سے ان کے دل و دماغ میں برپا افکار اور جذباتوں کے طوفانوں کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ شبلی نعمانی نے خواتین کی تعلیم اور اس کے حوالے سے انہیں معاشرے کا ایک کارگر اور مفید حصہ بنانے سے متعلق جن خیالات کا اظہار کیا ہے، وہ اس زمانے میں تو اپنے وقت سے بہت آگے کی بات تھے ہی آج بھی ان کی افادیت کم نہیں ہوئی ہے، کیوں کہ بہت سے مذہبی حلقوں میں آج بھی عورتوں کو محض گھر کی چہار دیواری کے اندر رکھنے اور چند معمولی دینی ضرورت کی معلومات فراہم کرنے تک محدود رکھنے کو ترجیح دی جاتی ہے۔

شبلی نعمانی طباعی، ذہانت اور ایجاد پسندی کی ایسی خداداد صلاحیتوں سے مالا مال تھے جنہیں ان کی حریت فکر نے مزید جلا دے دی تھی۔ تعقل اور تفکر کی قوتیں جو قدرت کی طرف سے ان پر رازاں کی گئی تھیں انہیں اپنے وقت کے نامور علماء اور ماہرین سے اکتساب فیض کے ذریعے مزید جلا حاصل ہوتی اور دھیرے دھیرے شبلی میں چیزوں کو اپنے طور پر دیکھنے اور اپنی رائے قائم کرنے کا اعتماد اور حوصلہ پیدا ہوا۔ یہ تعقل پسندی فطری طور پر شبلی کو سرسید کے زیر اثر لائی جو اپنی اجتہادی فکر و عمل اور اپنی بوقلموں شخصیت کے سبب اس زمانے کے جلیل القدر نمائندے اور اس کی شناخت بن چکے تھے۔ سرسید کے افکار کی کشش شبلی کو علی گڑھ لائی جہاں انہوں نے تقریباً سولہ برس ایک ایسے ماحول میں گزارے جو زبردست علمی تحقیق و تحریر کے ساتھ ساتھ شدید عملی سرگرمیوں سے عبارت رہا ہے۔ اس پورے عرصے میں شبلی نعمانی کی تمام ذہنی صلاحیتیں پوری کاملیت کے ساتھ بروئے کار نہ آتیں اگر انہیں سرسید کے افکار اور قربت سے وہ تحریک حاصل نہ ہوئی ہوتی جو علی گڑھ میں قیام کے دوران ان کے حصے میں آئی۔ اس تحریک نے شبلی کی خداداد قوتوں میں ایسی دھار پیدا کی جس کی زد میں خود سرسید کے بہت سے افکار اور سرگرمیاں بھی آ گئیں مگر اس کے باوجود ان دونوں عبقریوں کے درمیان ایک دوسرے کے لیے احترام کا رشتہ بے داغ رہا۔

اپنے علمی ماضی کی تجدید کے سلسلے میں فکر و شعور کے سفر کے دوران علامہ شبلی نے فلسفے اور

دیگر علوم میں مسلمانوں کے بیش بہا کارناموں سے قربت حاصل کی اور اپنے مقالات کے ذریعے ایک دنیا کو ان سے واقف کرایا۔ اس ضمن میں فلسفے کے میدان میں مسلمانوں کے اکتسابات کو انہوں نے بطور خاص نشان زد کیا کیونکہ فلسفے سے علامہ کے ذہن کو ایک نسبت خاص تھی۔ انہوں نے فلسفے سے متعلق مسلمانوں کے رد و قبول کے رویے کو گہرائی سے سمجھا اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والے مسلمانوں کے ایک خاص علمی اکتساب یعنی علم کلام پر نہایت عرق ریزی سے غور کیا اور اس پر عبور حاصل کیا۔ اس طرح علم کلام سے متعلق ان کی وہ تحریریں سامنے آئیں جن میں آج بھی ان کا کوئی ثانی نظر نہیں آتا۔

مسلمانوں کے علمی ماضی کی یاد تازہ کرنے کا مقصد مسلمانوں میں قومی فخر کے جذبات کو برا بھونچہ کرنا نہیں تھا بلکہ ان میں اپنے آپ پر یہ اعتماد پیدا کرنا تھا کہ وہ ایک شاندار علمی ورثہ اور روایت کے حامل ہیں۔ شبلی نعمانی نے ماضی شناسی کا سبق دیا مگر ساتھ ہی ماضی پرستی کے رجحانات پر سخت نکتہ چینی بھی کی۔ وہ چاہتے تھے کہ مسلمان نئے زمانے کے تقاضے سے ہم آہنگ ہوں اور ایک ایسی اجتہادی نظر پیدا کریں جس کی روشنی میں اپنے علمی ورثہ کی تجدید اور نئے علوم کو حاصل کر کے ان میں اسلامی جہت پیدا کرنے کی کوششیں کی جاسکیں۔ یہ حقیقت ثابت اور قائم کر دینے کے بعد کہ مسلمانوں نے اپنی علم پروری کے ذریعہ انسانی تہذیب کے ارتقاء میں بیش بہا خدمات انجام دیں جو کسی بھی دوسری قوم سے نہ صرف کم تر نہیں بلکہ بعض اعتبارات سے فزوں تر ہیں، فطری تھا کہ علامہ شبلی اس ماضی کے آئینے میں اپنے حال کو دیکھتے اور موجودہ صورت حال کو درست کرنے پر مائل ہوتے۔ شبلی کا زمانہ قدیم و جدید کی شدید کشمکش کا زمانہ تھا اور اس وقت کے اہل نظر سرسید کی تحریک اور رہنمائی کے تحت یہ محسوس کر رہے تھے کہ مسلمان اپنے تقلیدی رویے کے سبب علم کے میدان میں کچھڑ رہے ہیں۔ اس صورت کو انگیز کرنے اور اس میں مثبت تبدیلی لانے کے لیے ضروری تھا کہ مسلمانوں کے تعلیمی نظام پر نظر ثانی کی جائے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ علامہ شبلی جس شدت سے علمی تحقیق پر متوجہ تھے اسی شدت سے ان کا ذہن تعلیم کی اصلاح پر بھی مرکوز تھا۔ اس سلسلے میں انہوں نے سب سے پہلے مسلمانوں کو قدیم و جدید خیمہ بندی سے باہر نکلنے کی تلقین کی۔ وہ کہتے ہیں:

”آج کل مسلمانوں میں دو گروہ جدا جدا ہو گئے ہیں۔ قدیم تعلیم یافتہ یہ

خیال کر کے کہ دین میں مشغول ہونے سے وہ دنیا کو کسی طرح حاصل نہیں کر سکتے محض دین میں منہمک ہو گئے ہیں۔ اور جدید تعلیم یافتہ یہ خیال کر کے کہ وہ دنیا کے درپے ہو کر دین میں کمال حاصل نہیں کر سکتے، محض دنیوی تعلیم میں سرگرم پائے جاتے ہیں۔ سچ یہ ہے کہ دونوں گروہ غلط فہمی پر ہیں اور اس صراط مستقیم پر ان میں سے کوئی گروہ قائم نہیں ہے جس کی ہدایت اسلام نے کی ہے۔ جدید تعلیم یافتہ خیال کرتے ہیں کہ جب تک مسلمان یورپ کے علوم جدیدہ سیکھ کر ان میں کمال حاصل نہ کریں گے، مسلمانوں کی قوم ترقی نہیں کرے گی۔ قدیم تعلیم یافتہ خیال کرتے ہیں کہ یورپ کا سائنس اور فلسفہ حاصل کرنے سے مسلمانوں کے مذہبی عقائد میں خلل آجائے گا اور اگر مسلمان مسلمان نہ رہے تو ان کی دنیوی ترقی میں مسلمانوں کی قومی ترقی کسی طرح نہیں ہو سکتی۔ یہ خیالات ہیں جن کے سبب دونوں گروہ متحد نہیں ہو سکتے اور ایک دوسرے کے ساتھ مصافحہ کرنا نہیں چاہتے۔“ (۱)

تعلیم کے موضوع پر شبلی کی پہلی مختصر تصنیف ”مسلمانوں کی گزشتہ تعلیم“ کے عنوان سے ۱۸۸۷ء میں شائع ہوئی۔ (۲) یہ اگرچہ ایک مضمون تھا جو ایجوکیشنل کانفرنس کی دعوت پر لکھا گیا تھا، اور اس کے اجلاس منعقدہ ۲۷ دسمبر ۱۸۸۷ء قیصر باغ لکھنؤ میں پڑھ کر سنایا گیا مگر سید سلیمان ندوی کے بقول ”یہی وہ مطلع ہے جس سے علامہ شبلی کی شہرت کا آفتاب سب سے پہلی دفعہ طلوع ہوا۔“ (۳) اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ مولانا کا علمی و فکری خمیر جن بنیادوں پر تیار ہوا تھا، ان میں تعلیم کے موضوع سے مولانا کی گہری دلچسپی شامل تھی۔ اور حقیقت یہ ہے کہ وہ تاحیات اس موضوع پر سوچتے، لکھتے اور بولتے رہے۔ ان کی دینی، ملی اور اجتماعی فکر کے تعلق سے یہ فکر سب سے زیادہ نمایاں نظر آتی ہے۔

اس فکر کا محور ہندوستان میں مسلمانوں کے نظام تعلیم کی اصلاح اور اس کی تشکیل نو تھا۔ وہ ہمہ تن اس کے لیے کوشاں اور ہمہ دم اس کے لیے بے تاب و مضطرب رہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ شبلی کی نظر میں زوال آمادہ ملت اسلامیہ کو عروج و ترقی کی راہوں پر گامزن کرنے کے لیے اس کے اندر تعلیم کا فروغ لازمی تھا۔ جس میں بحیثیت مجموعی مسلم قوم بہت پیچھے تھی۔ جب کہ دنیا کی دوسری

قومیں بہت آگے بڑھ چکی تھیں۔ دوسری طرف شبلی کی نظر میں بد قسمتی سے نہ صرف ہندوستان میں بلکہ عالم اسلام کے اکثر حصوں میں مسلمانوں کی تعلیم کا ڈھانچہ بگڑ چکا تھا۔ اس کی بنیادیں متزلزل ہو چکی تھیں۔ جب تک تعلیمی نظام اپنی صحیح بنیادوں پر استوار نہ ہو جائے، اس وقت تک مسلمانوں کی اجتماعی ترقی اور فلاح و بہبود کی توقع نہیں کی جاسکتی تھی۔ مولانا تاریخ اسلامی کے شناور تھے۔ مسلمانوں کے عہد زریں کی قابل رشک تاریخ ان کی نگاہوں میں کھلی کتاب کی طرح تھی جس کا ایک ایک ورق دوسری قوموں کے مقابلے میں علمی برتری کی داستانِ عظمت سے مزین تھا۔ اس لیے وہ تعلیم کے تعلق سے مسلمانوں کے اندر پائی جانے والی بے اعتنائی پر شدید رنج و غم کا اظہار کرتے تھے۔

۱۸۹۲ء میں شبلی نے ترکی اور مصر و شام کا سفر کیا تھا جس کی روداد انہوں نے ”سفر نامہ روم و مصر و شام“ کے عنوان سے تحریر کی۔ اس میں وہ نہایت قلق و اضطراب کے ساتھ لکھتے ہیں:

”حقیقت یہ ہے کہ کل دنیائے اسلام میں تعلیم کا طریقہ ایسا ابترا و ذلیل ہو گیا

ہے کہ چند درسی کتابوں کے سوالگوں کو کسی قسم کی جدید معلومات کی طرف رغبت ہی

نہیں ہوتی جس کا یہ نتیجہ ہے کہ جدت اور ایجاد کا مادہ قوم سے مسلوب ہوتا جاتا ہے۔

اور جس قدر کہیں کہیں کچھ اور بچا ہے، آئندہ اس کی بھی امید نہیں۔“ (۴)

ہندوستان میں مسلمانوں کی تعلیم کا مسئلہ: شبلی کی علمی کوششوں کا ایک اہم میدان اور عنوان ہندوستان میں مسلمانوں کی تعلیم کا فروغ اور اسے ایسی مضبوط بنیادوں پر قائم کرنا تھا کہ جو ایک طرف دور غلامی میں ان کے لیے آزادی و ترقی کی راہ کو کھول سکے، دوسری طرف وہ مذہب سے ان کے رشتے کو مستحکم کرنے میں معاون ہو۔ چنانچہ شبلی نے مختلف پلیٹ فارموں سے اس کے لیے کوششیں کیں۔ انہیں جہاں بھی اس غرض سے بلایا گیا وہاں گئے اور جس طرح کا بھی ان سے تعاون طلب کیا، وہ انہوں نے دیا۔ چنانچہ سرسید کی خواہش پر انہوں نے علی گڑھ سے رشتہ قائم کیا اور وہاں تدریس کے فرائض انجام دیے۔ وہاں ان کے قیام سے اس کی فضا پر نہایت گہرے اثرات قائم ہوئے۔ شبلی نے جس وقت علی گڑھ میں قدم رکھا، اس وقت علی گڑھ کی فضا پر مغرب پسندی اور مغربی تہذیب و ثقافت کی اندھی نقالی کی دھند چھائی ہوئی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ اس دھند کو کم کرنے اور طلبہ کو تعلیم کے اصل اور فطری مقاصد سے باخبر و ہم آہنگ کرنے میں انہوں نے اہم کردار ادا کیا۔



خوشبلی کو بھی اس کا احساس تھا۔ مولوی حکیم محمد عمر کے نام اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں:

”مجھ کو اس بات کا فخر حاصل ہے کہ اس نئی زندگی کے پیدا ہونے میں میرا

بھی حصہ ہے۔ اور اس جوش مذہبی کا براہیچہ کرنا میری قسمت میں بھی تھا۔“ (۵)

حقیقت یہ ہے کہ علی گڑھ کو ایک مسلم یونیورسٹی کی شکل دینے میں شبلی نے اہم کردار ادا کیا۔ یونیورسٹی کے تخیل کو عملی جامہ پہنانے میں ہزہائی نس سر آغا خاں سب سے زیادہ پیش پیش تھے۔ انہوں نے ہی اپنی کوششوں سے یونیورسٹی کے لیے اکتیس لاکھ کی خیر رقم جمع کی تھی۔ شبلی نعمانی نے ان کی کوششوں کو جس طرح سراہا وہ ان کے اس جملے سے ظاہر ہے: ”حکومت انگریزی کی ابتدائی تاریخ سے آج تک مسلمانوں نے کبھی ایسی بلند ہمتی کا اظہار نہیں کیا جو آج ایک یگانہ قوم ہزہائی نس سر آغا خاں کی ذات سے وجود میں آئی“ (۶)۔ لکھنؤ میں جب مسلم یونیورسٹی کا وفد آیا تو نہایت خوشی کے ساتھ اس کی کوششوں میں شرکت کی۔ الودہ میں اس تعلق سے مضمون لکھا اور اس کی زبردست حوصلہ افزائی کی۔ لاہور میں جب اس کا وفد گیا تو خود مولانا شبلی بھی اس کے رکن تھے۔ چنانچہ وہیں اپنی وہ مشہور فارسی نظم پڑھی جس کا مطلع اور چند اشعار یہ ہیں:

ہمیں یک حرف از یونیورسٹی مدعا باشد کہ ایں سرشتہ تعلیم ما در دست ما باشد  
علوم تازہ را با شرع و حکمت باہم آمیزیم الہی با ریاضی و طبعی آشنا باشد  
بساط تازہ چینیم و طرح نو در اندازیم کہ در بزم نوے پیشینیاں را نیز جا باشد  
ولے پیدا نہ شد ایں خواب را چوں صبح تعبیرے گماں بردیم ملک اندیشہ از روئے خطا باشد  
بکیش شیعہ و سنی سر آغا خاں خدا نبود و لیکن کشتی اسلامیان را نا خدا باشد (۷)

(یونیورسٹی کے قیام سے ہمارا صرف یہی ایک مقصد ہے کہ ہماری تعلیم کا نظام و سلسلہ ہمارے ہاتھ

میں ہونا چاہیے۔ جدید علوم کو ہم شرع اور حکمت سے باہم کر دیں۔ اور اسلامی فلسفہ کی ریاضی اور

سائنس سے آشنا ہو۔ ہم نئی بساط چینیں اور جدید نقشہ تیار کریں۔ اور اس نئے سانچے میں اسلاف کی

بھی جگہ ہو۔ لیکن یہ خواب صبح کی تعبیر کی طرح ظاہر نہیں ہو پایا۔ ہم اپنے قومی مفاد کا خیال رکھیں اور

اس میں کوئی کمی نہ رہ جائے۔ شیعہ و سنی کے نزدیک سر آغا خاں خدا تو نہیں ہیں۔ لیکن وہ مسلمانوں کی

کشتی کا نا خدا ضرور ہیں)



اس کے علاوہ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد کے نصاب کی تشکیل نو میں شبلی نے ہی بنیادی کردار ادا کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ شبلی ہی ہیں جنہوں نے حیدرآباد میں ایک آزاد اور مستقل یونیورسٹی کا تمہیدی خاکہ پیش کیا (۸)۔ نیز بھوپال کے عربی مدارس، مشرقی بنگال اور آسام کے مدارس کی اصلاح، شملہ میں مشرقی علوم و فنون کی ترقی و اصلاح اور ان کا فروغ اور ڈھاکہ یونیورسٹی کے نصاب کی تشکیل میں شبلی نے اپنی ذاتی دلچسپیوں سے اہم کردار ادا کیا۔

تاہم حقیقت یہ ہے کہ اپنے تعلیمی افکار کی عملی تعبیر کا اصل مرکز وہ ندوۃ العلماء کو تصور کرتے تھے۔ ندوۃ العلماء سے ان کی بڑی امیدیں وابستہ تھیں۔ وہ ندوہ کو ایک ایسے ادارے کی شکل میں دیکھتے تھے جو مسلمانوں کی تعلیم کی زریں تاریخ کا نمائندہ ہو۔ وہ اسے ایک مدرسہ کے بجائے ایک بڑے دارالعلوم اور جامعہ اسلامیہ کی شکل میں دیکھتے تھے۔ اس کا اندازہ ندوہ اور اصلاح نصاب کے تعلق سے ان کے مضامین اور خطبات سے ہوتا ہے۔ لیکن افسوس کی بات ہے کہ ندوہ کے تعلق سے ان کے وسیع خواب کی تعبیر ممکن نہ ہو سکی۔

شبلی کا تعلیمی نظریہ اور عہد حاضر میں اس کی معنویت: تعلیم کے تعلق سے شبلی کا نقطہ نظر نہایت وسیع النظری پر مبنی تھا۔ وہ ایک ایسے تعلیمی نصاب و نظام پر زور دیتے تھے جو ایک طرف موجودہ عہد کے تمدنی تقاضوں سے پوری طرح ہم آہنگ اور اس کے چیلنجوں سے عہدہ برآ ہونے کی صلاحیت رکھنے والا ہو تو دوسری طرف اس میں مذہب کو فکری اور عملی سطح پر اساسی حیثیت حاصل ہو۔ وہ مذہب کے اصولی تقاضوں کو نظر انداز کرتے ہوئے کسی بھی نوع اور کسی بھی سطح کی تعلیم کو اسلامی سماج اور انسانیت کے لیے مفید تصور نہیں کرتے تھے۔ وہ جدید و قدیم اور مذہبی و تمدنی تعلیم کے مناسب امتزاج پر زور دیتے تھے۔ اس طرح ان کی نظر میں نہ تو یورپ کا تعلیمی منظر نامہ قابل رشک تھا، جس کی تقلید کی جاسکے اور نہ ہی مسلم دنیا کا فرسودہ و پیش پا افتادہ نظام تعلیم اس قابل تھا کہ اسے باقی رکھنے پر اصرار کیا جائے۔ سرسید کے ساتھ شبلی کے اختلافی نقطہ نظر کی بنیاد یہی تھی کہ ان کی نظر میں سرسید کے مدرسۃ العلوم میں مذہب کو اساسی حیثیت حاصل نہیں تھی۔ شبلی آخری حد تک مشرقی علوم کے حامی و موید تھے۔ ان کی نظر میں اس کی اصلاح اور تشکیل نو کی ضرورت تھی نہ کہ سرے سے اس سے دست بردار اور دامن کش ہو جانے کی۔ تعلیم کا بنیادی خاکہ ان کی نگاہ میں مشرقی تعلیم پر ہی

مشتمل تھا۔ محض مغربی تعلیم کی بنیاد پر حاصل ہونے والی ترقی کو وہ مسلمانوں کی ترقی تصور نہیں کرتے تھے۔ مقالات شبلی حصہ سوم میں ان کے ”مشرقی کانفرنس“ اور ”احیائے علوم عربیہ اور ایک ریڈیکل“ جیسے مضامین سے ان کے اس نقطہ نظر پر واضح روشنی پڑتی ہے۔ سفرنامہ روم و مصر و شام میں لکھتے ہیں:

”میرا ہمیشہ سے یہ خیال ہے اور میں مضبوطی سے اس پر قائم ہوں کہ مسلمان مغربی علوم میں گو ترقی کے کسی رتبہ تک پہنچ جائیں لیکن جب تک ان میں مشرقی تعلیم کا اثر نہ ہو، ان کی ترقی مسلمانوں کی ترقی نہیں کہی جاسکتی۔ بے شبہ مشرقی تعلیم کی جو موجودہ اسکیم ہے، وہ نہایت ابترا اور غیر ضروری ہے، لیکن اسی تعلیم میں ایسی چیزیں بھی ہیں جو مسلمانوں کی قومیت کی روح ہیں اور جس تعلیم میں اس روحانیت کا مطلق اثر نہ ہو وہ مسلمانوں کے مذہب، قومیت، تاریخ کسی چیز کو بھی زندہ نہیں رکھ سکتی۔“ (۹)

سرسید سے متعلق اس شکوے کا انہوں نے متعدد مواقع پر اظہار کیا ہے کہ وہ مشرقی تعلیم کو قومی فلاح و بہبود کے لیے نقصان دہ سمجھتے تھے۔ جب پنجاب یونیورسٹی میں مشرقی تعلیم کی شاخ کا قیام عمل میں آیا تو سرسید نے اس کی مخالفت میں پے پے تین مضامین تحریر کیے۔ شبلی کے الفاظ میں ”پنجاب یونیورسٹی پر ان کے تین پرزور آرٹیکل قلعہ شکن تو ہیں تھیں، جن کے صدمے نے مشرقی تعلیم کو چکنا چور کر دیا۔“ (۱۰)

شبلی کے تعلیمی نقطہ نظر میں تربیت کو بھی خصوصی اہمیت حاصل ہے۔ وہ محض تعلیم کے حصول کو کافی تصور نہیں کرتے تھے۔ افراد سازی ان کے مزاج کا حصہ تھی جس کو وہ تعلیمی نظام اور منصوبہ بندی کا ایک اہم مقصد اور حصہ تصور کرتے تھے۔ ندوۃ العلماء کے پلیٹ فارم سے اپنے تعلیمی منصوبوں کو شرمندہ تکمیل نہ ہوتے ہوئے دیکھ کر وہ بار بار اس کا اظہار کرتے نظر آتے ہیں کہ انہیں دائرہ عمل کو تبدیل کر کے دوسرے ادارے پر محنت کرنی چاہئے اور اس کو گروکل کے طرز پر چلانے کی کوشش کرنی چاہئے۔ اس وقت گروکل کی تعلیم سادگی و قناعت اور جہد و جفاکشی کا مثالی نمونہ تھی، تربیت کے لحاظ سے وہ گروکل کے نظام کو قابل تقلید سمجھتے تھے۔ اپریل ۱۹۱۰ء میں مولانا

حمید الدین فراہی کو لکھتے ہیں:

”کیا تم چند روز سرائے میر کے مدرسہ میں قیام کر سکتے ہو۔ میں بھی شاید آؤں اور اس کا نظم و نسق درست کرایا جائے۔ اس کو گروکل کے طور پر خالص مذہبی مدرسہ بنانا چاہیے یعنی سادہ زندگی اور قناعت اور مذہبی خدمت مطمح زندگی ہو۔“ (۱۱)

جدید تعلیم سے متعلق شبلی کا نقطہ نظر: شبلی مذہبی یا مشرقی تعلیم کے حامی و موید بلکہ اس کی زلف گرہ گیر کے اسیر ضرور تھے، تاہم جدید یا عصری تعلیم کی ضرورت کے وہ نہ صرف قائل تھے بلکہ موجودہ عہد میں مذہبی و تمدنی تقاضوں کی تکمیل کے لیے بھی اس کو ناگزیر خیال کرتے تھے۔ انہوں نے نظریاتی سطح پر ہی نہیں تھا بلکہ مختلف عملی سطحوں پر اس کی کوشش و کاوش بھی کی۔ چنانچہ ۱۸۸۳ء میں انہوں نے انگریزی تعلیم کے لیے ایک اسکول قائم کیا۔ اپنی مختلف تحریروں اور تقریروں میں انہوں نے مسلمانوں کی توجہ حلقہ علم و دانش کے اس پہلو کی طرف مبذول کرنے کی کوشش کی کہ قدیم نافع کے ساتھ جدید صالح کے حصول کے بغیر کوئی قوم ترقی کے منازل طے نہیں کر سکتی۔ (۱۲)

شبلی علماء کے اس گروہ کے ناقد تھے جس کی نظر میں علوم جدیدہ کے حصول کی زد مذہبی عقائد پر پڑتی تھی۔ ان کی نظر میں علماء کے لیے ان کے حصول کا فائدہ یہ تھا کہ غزالی کی طرح ان علوم کو حاصل کرنے سے ان کو وہ مسائل معلوم ہو جائیں گے جن میں مذہبی مخالفت کا احتمال پیدا ہو سکتا ہے۔ ایک جگہ تو انہوں نے کھل کر اس بات کا اظہار کیا ہے کہ: ”علماء کو علوم عربیہ کے ساتھ علوم غریبیہ بھی حاصل کرنا چاہئیں“۔ (۱۳)

دینی مدارس کے نصاب کی اصلاح فکر شبلی کے آئینے میں: شبلی کے تعلیمی افکار و نظریات کا ایک اہم پہلو دینی مدارس کی تعلیم و تربیت سے تعلق رکھتا ہے۔ مندرجہ بالا سطور میں بعض مقامات پر اس کی طرف ضمنی اشارے کیے جا چکے ہیں، تاہم ان سطور پر الگ سے نگاہ ڈالنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ شبلی نعمانی زندگی بھر اس بات کے لیے کوشاں رہے کہ ہندوستان کے دینی مدارس کی تجدید نو کی جائے۔ ان کے نصاب و نظام کو از سر نو مرتب کیا جائے تاکہ مدارس سے ایسی نسل نکل سکے جو موجودہ دور میں اسلام کی دعوت و اشاعت کی خدمات انجام دے سکے اور اسلامی

عقائد و نظریات پر ہونے والے اعتراضات کے تعلق سے وہ اسلام کے دفاع پر کمر بستہ ہو سکے۔ ان کے خیال میں جدید و قدیم علوم کے حاملین کے جو دو گروہ مسلم معاشرے میں پیدا ہو گئے تھے اور ان میں کشمکش کی جو صورت حال قائم تھی وہ کسی بھی طرح امت کے حق میں نہیں تھی۔ ندوۃ العلماء کی تاسیس کے اغراض میں ان کی نظر میں یہ بات شامل تھی کہ اس کی تعلیم سے ”ایسے روشن خیال علماء پیدا ہوں جو دونوں قسم کے علوم کے جامع ہوں اور وہ جدید اور قدیم گروہوں کے درمیان رابطہ و اتحاد کا کام دیں اور اسلام کا وہ مکمل نقشہ ان کے پیش نظر ہو جس میں دین اور دنیا دونوں جمع کیے گئے ہوں۔ (۱۴)

علامہ شبلی کی نظر میں درس نظامی کے نصاب کی اپنی بہت سی خوبیاں تھیں، ان خوبیوں کا انہوں نے اعتراف کیا ہے (۱۵)۔ لیکن اسی کے ساتھ ہی وہ اس میں وسیع تبدیلیوں کو وقت کا نہایت اہم تقاضا تصور کرتے تھے۔ ان کے نظریے کے مطابق ہندوستان میں مسلمانوں کے علمی تنزل کا اصل سبب ہی ”نصاب تعلیم کا نقص“ تھا (۱۶) اس لیے وہ علوم عالیہ اور علوم آلیہ دونوں میں اصلاح کو ایک جامع نصاب تعلیم کی تشکیل کے لیے ضروری امر تصور کرتے تھے۔ ندوہ کے مختلف اجلاسوں میں انہوں نے بار بار اس کی آواز بھی اٹھائی اور اس کے پلیٹ فارم سے انہوں نے اس کی کوششیں بھی کیں۔ اگرچہ شبلی کو اصلاح نصاب کے تعلق سے اپنے خاکے میں رنگ بھرنے کا پوری طرح موقع نہیں مل سکا تاہم اس تعلق سے ان کی فکری و علمی کوششوں سے ہندوستان کی دینی تعلیم کی فضا پر مثبت اور گہرے اثرات و نقوش مرتب ہوئے۔

اخیر میں خلاصہ کلام کے طور پر کہا جاسکتا ہے کہ شبلی کی تعلیمی فکر انتہائی متوازن اور جامعیت کی حامل تھی۔ ان کے معاصرین میں اس توازن و جامعیت کی جھلک کم نظر آتی ہے اور یہی شبلی کا سب سے اہم امتیاز ہے۔

ہندوستانی مسلمانوں کی تعلیم سے متعلق شبلی کی تعلیمی فکر آج بھی اتنی ہی معنویت کی حامل ہے جتنی کہ وہ کل تھی۔ مسلمانوں کے تعلیمی تقاضے پر ان کا یہ تبصرہ آج بھی اتنا ہی پُر مغز اور قابل عمل ہے جتنا کہ وہ کل تھا کہ: ”ہم مسلمانوں کے لیے نہ صرف انگریزی مدرسوں کی تعلیم کافی ہے، نہ قدیم عربی مدرسوں کی۔ ہمارے دور کا علاج ایک مجنون مرکب ہے جس کا ایک جز مشرقی اور

دوسرا مغربی ہے۔ (۱۷)

علامہ شبلی کا یہ تصور علم اور ان کی یہ تعلیمی بصیرتیں محض قصہ پارینہ نہیں ہیں۔ اگرچہ ہم نے اپنے علم و دانش کے نہ جانے کتنے گہر ہائے گراں مایہ کو طاق نسیاں پر ڈال دیا ہے مگر شبلی کے تعلیمی افکار اس قدر توانا ہیں اور ان کی توانائی میں اس قدر فوری لازمیت موجود ہے کہ ہم اپنے تمام تر شیوہ فراموشی کے باوجود ان سے دامن کش نہیں ہو سکتے۔ علامہ کے تعلیمی افکار اور انہیں بروئے کار لانے کے لیے ان کی عملی جدوجہد آج بھی ہماری رہنمائی کے لیے ہمارے آس پاس روشنی کے ایک ہالے کی طرح موجود ہے، خاص طور پر اس پس منظر میں کہ جدید و قدیم کی کشاکش جوان کے زمانے میں مسلم ذہن و فکر کو درپیش تھی آج بھی ایک اور عنوان سے اور نئی شدت کے ساتھ ظہور پذیر ہو رہی ہے۔ اس کشاکش سے نبرد آزما ہونے اور اس سے ایک متوازن راہ نجات حاصل کرنے کے لیے علامہ شبلی ہمارے سب سے بڑے رہنما ہو سکتے ہیں کہ وہ نہ تو ماضی پرست تھے نہ مشرق کے بے جا مقلد اور نہ مغرب سے مرعوب محض۔ علامہ نے ہمیں ماضی کے فرسودہ عناصر کو مسترد کر کے اس کی زندہ توانائی کو عصری ذہن و فکر کی با معنی اور مثبت روشنیوں سے آمیز کر کے ایک نئی اسلامی دانش کو ترکیب دینے کا جو گر سکھایا تھا، آج اسے آج علم و آگہی کے بند خزانوں کی کلید بنایا جاسکتا ہے۔ مسلم دانش کے لیے اس چیلنج کا سامنا اور اس سے سرخ رو گذرے بغیر کوئی چارہ نہیں۔

### حوالہ جات

- (۱) خطبات شبلی (طبع سوم): مرتبہ مولانا سید سلیمان ندوی، دارالمصنفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ، ۱۹۹۰ء، ص ۸۸-۹۸۔
- (۲) حیات شبلی: مولانا سید سلیمان ندوی، دارالمصنفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ، ۲۰۰۸ء، ص ۱۵۹- (۳) ایضاً۔ (۴) سفرنامہ روم و مصر و شام، شبلی نعمانی، دارالمصنفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ، ۱۹۹۹ء، ص ۸۴- (۵) مکاتیب شبلی (حصہ اول)، مطبع معارف، اعظم گڑھ، ۱۹۶۶ء، ص ۴۷- (۶) حیات شبلی، حوالہ بالا، ص ۴۱۵- (۷) ایضاً، ص ۴۱۵- (۸) ایضاً، ص ۴۰- (۹) سفرنامہ روم و مصر و شام، حوالہ بالا، ص ۱۶۰- (۱۰) مقالات شبلی (جلد سوم)، مرتبہ: مولانا سید سلیمان ندوی، مطبع معارف، اعظم گڑھ، (طبع دوم) ۱۹۵۵ء، ص ۱۳۶- (۱۱) مکاتیب شبلی، (جلد دوم)، مرتبہ: مولانا سید سلیمان ندوی، مطبع معارف، اعظم گڑھ، ۱۹۶۷ء، ص ۳۹- (۱۲) مکاتیب شبلی، حوالہ بالا، ص ۵۴-۵۵- (۱۳) خطبات شبلی، حوالہ بالا، ص ۹۰- (۱۴) ایضاً، ص ۹۱- (۱۵) مقالات شبلی، حوالہ بالا، ص ۱۲۴- (۱۶) ایضاً، ص ۱۲۸- (۱۷) ایضاً، ص ۱۵۷-

## فن تاریخ گوئی میں علمائے باقیات کا حصہ

ڈاکٹر راہی فدائی

تاریخ گوئی کا فن دراصل سمندر کو قطرہ قطرہ کوزے میں سمونے کا فن ہے۔ یہ باوقار و ذی اعتبار فن ایک ایسے مسافر کی طرح ہے جو حال کی پرچہ و طلسماتی راہوں سے گزر کر ماضی کی منزل مقصود کی طرف گامزن ہے، تاریخ گوئی کا یہ ہنر انتہائی مشکل ہونے کے باوجود بہت ہی مفید اس لیے ہے کہ اس کے توسط سے موجودہ واقعات و حالات کا تحفظ، گزرے ہوئے کل کے سانحات و ساعات کا تعین اور مستقبل کے حادثاتی لمحات کا تشکل ممکن ہوتا ہے جس سے تاریخ و تحقیق کے باذوق طالب کے لیے صحیح و مدلل معلومات کی فراہمی سہل ہو جاتی ہے۔ تاریخ گوئی کی تعریف اور تفصیل بیان کرتے ہوئے عصر حاضر کے ماہر فن حضرت علامہ اشرف سعودی باقوی رقم طراز ہیں:

”تاریخ ایسے مناسب لفظ یا الفاظ میں کسی واقعے کو بیان کرنے کا نام ہے جن کے اعداد حروف سے سن مطلوبہ حاصل ہو، یہ بیان نظم و نثر دونوں میں ہوتا ہے، نظم میں اکثر جز و مصرع یا کامل مصرع حصول مقصد کے لیے کافی ہوتا ہے لیکن کبھی کبھی تکمیل مقصد کے لیے اس سے زیادہ کی بھی ضرورت پیش آتی ہے۔ تاریخ بہت مشکل، دقیق، مختلف الاقسام اور طویل الذیل فن ہے۔“ (ماخوذ از: نفیر ویلور ۱۴۱۳ھ، ص ۲۱، مضمون ”تاریخی قطعے“)

بعض اہل قلم نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ اس فن کے موجد عرب العرباء ہیں، حالانکہ تاریخی اعتبار سے یہ قرین قیاس نہیں ہے۔ یہ اس لیے کہ اس فن لطیف میں حروف ابجد سے اعداد کا حساب لگایا جاتا ہے جبکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے کہ ”انما امیة لا نکتب ولا

”نحسب“ (بخاری) یعنی ہم ایک ان پڑھ قوم ہیں، نہ لکھنا جانتے ہیں اور نہ حساب کرنا۔ اس حدیث شریف کی موجودگی میں ”مشکوٰۃ التاریخ“ کے مصنف جناب خداداد خان موٹس جے پوری کا ادعا کہ ”تاریخ گوئی ایک عجیب فن ہے جس کے موجد عرب کے وہ زبان دان ہیں جن کی بدولت عربی زبان کو ”ام اللسان“ (?) تسلیم کیا جاتا ہے۔ (ص ۷ مطبوعہ ۲۰۱۲ء راجستھان اردو اکادمی، جے پور) قابل قبول نہیں ہوگا۔ یہاں سیرت طیبہ کے اس واقعہ کا ذکر بے محل نہ ہوگا کہ مدینہ منورہ میں تعلیم یافتہ یہود کا ایک گروہ حضور اکرم کی خدمت اقدس میں حاضر ہوا، آپ نے انہیں ایمان کی ترغیب دینے کی خاطر سورہ بقرہ کی ابتدائی آیتیں سنائیں۔ ان یہودیوں نے سورہ بقرہ کی ابتدائی آیت کریمہ ”الْم“ سن کر اس کے عدد اکھتر (۱۷) کو ذہن میں رکھتے ہوئے کہا ”کیف ندخل فی دین مد تہ احدی و سبعون سنة“، یعنی ہم اس دین کی پیروی کیسے کریں جس کی عمر صرف اکھتر سال ہے۔ آپ نے ان لوگوں کی کج فہمی کو ملاحظہ فرمانے کے بعد مسکراتے ہوئے دیگر حروف مقطعات اَلْمَصّ، کَہٰیْلَعَصّ وغیرہ کی تلاوت فرمائی تو وہ یہود مبہوت و پریشان ہو گئے۔ (بیضاوی شریف)۔ اس واقعہ سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ یہودی علماء تاریخ گوئی کے فن سے واقف ہی نہ تھے بلکہ اپنی دانست میں اس سے نتائج کا بھی استنباط کرتے تھے۔ غرض کہ یہ فن زمانہ جاہلیت میں یہودیوں کے ساتھ میل جول کی وجہ سے عربوں میں منتقل ہوا اور پھر اسلام کے ورود مسعود کے بعد مسلمانوں کے تعلیمی اشتغال اور فنی انہماک کے سبب دیگر فنون کی طرح اسے بھی خوب نشوونما پانے اور ترقی و ترویج کے مراحل طے کرنے کا موقع ہاتھ آیا۔ بعد ازاں اس وقیع علم کو ایرانیوں نے گلے لگا لیا۔ چنانچہ اہل فارس نے تاریخ گوئی میں نئے نئے تجربے کیے اور اس فن کو بام عروج تک پہنچا دیا۔ اس کے بعد لسانیات کے اخذ و قبول کے اصول کے تحت اردو زبان نے اس فن کی خوبیوں کے مدنظر فارسی ادبیات سے لے کر اپنے دامن میں بھرتے ہوئے اسے اپنی نازک خیالی اور بلند فکری کے گل بوٹوں سے آراستہ کر دیا۔ چنانچہ اردو شعراء وادبانے اس فن شریف میں اپنی طباعی و خلاقی کا مظاہرہ اس طور پر کیا کہ اردو کا خزانہ ادب تاریخ گوئی کے عمدہ و تابندہ لعل و گہر سے بہرہ ور ہو گیا، اس طرح ہر عہد میں اس معدن زر و جواہر میں مسلسل اضافہ ہوتا رہا۔ علم جفر کے اس گنجینہ علم و ادب کا ایک معتد بہ حصہ اور تاریخ گوئی کے اس سلسلہ زریں کا



بیش بہا حلقہ علمائے جامعہ باقیات صالحات، ویلور (قائم شدہ ۱۲۷۹ھ مطابق ۱۸۶۲ء) کی ادبی خدمات کی صورت میں تاریخ کے گمشدہ اوراق پارینہ میں پوشیدہ تھا جسے راقم الحروف مختلف مصادر و مآخذ سے تلاش کر کے اہل علم کے ذوق طبع کی تسکین کے لیے پیش کر رہا ہے تاکہ باقیات کی علمی و ادبی تاریخ کا یہ روشن پہلو محققین کی توجہ خاص کا مرکز اور مورخین کے زور قلم و دائرہ کار کا محور بنارہے۔

یہاں یہ بات ذہن نشین رہے کہ بے شمار علمائے باقیات میں سے ہمارے پیش نظر وہی منتخب فضلا ہیں جن کے کارنامے کسی نہ کسی طور تاریخ کا حصہ بن سکے ہیں اور جنہیں شعر و ادب سے تعلق خاطر رہا ہے، ہم انہیں میں سے اہم ترین شخصیتوں کا اجمالی تذکرہ و تعارف نذر قارئین کر رہے ہیں۔

حضرت شاہ فخر ویلوری: حضرت علامہ حافظ قاری الحاج شاہ عبدالقادر بادشاہ فخر ویلوری (ولادت - ۱۲۷۰ھ - وفات ۱۳۳۳ھ) کے جد اعلیٰ ملک یمن سے وارد ہند ہوئے تھے۔ ان کے والد ماجد قاری یوسف علی بادشاہ یمنی فرزند مولانا حافظ قاری ابراہیم علی بادشاہ یمنی کا شمار ملک کے ممتاز علماء میں ہوتا ہے۔ حضرت فخر حضرت وہاب العلوم بانی مدرسہ باقیات صالحات کے خالہ زاد بھائی ہونے کے علاوہ تلمیذ ارشد اور خلیفہ خاص بھی تھے۔ ان کو انشا و تحریر اور وعظ و تذکیر میں یکساں مہارت حاصل تھی، وہ فصیح و بلیغ اور شیریں بیاں مقرر تھے اور عوام و خاص میں سلطان الواعظین کے لقب سے پہچانے جاتے تھے۔ جیسا کہ حضرت علامہ علمی باقوی (متوفی ۱۹۶۱ء) نے فرمایا

عالم ایزد پرست و واعظ شیریں زباں در بلاغت آنکہ بودہ غیرت سجاں چہ شد

(مرثیہ ترکیب بند، مطبوعہ ۱۳۳۴ھ مدراس)

انہوں نے حضرت بانی علیہ الرحمہ کے خلف صالح حضرت علامہ قاری ضیاء الدین محمد عبدالقادر (ولادت ۱۲۸۱ھ وفات ۱۳۶۰ھ) کے ہمراہ مدرسہ صولیہ، مکہ مکرمہ میں حضرت پایہ خرمن علامہ رحمت اللہ کیرانوی مہاجر کی (متوفی ۱۳۰۸ھ) کی سرپرستی میں علوم متداولہ میں تخصص حاصل کیا اور تفسیر و حدیث کے علاوہ فقہ و اصول میں کمال درجے کی استعداد بہم پہنچائی۔ اور اپنے شیخ کے حکم کی تعمیل میں مسائل خطر و اباحت پر مشتمل ایک مبسوط کتاب بنام ”الباقیات الصالحات“



تصنیف کی جو ۱۳۲۲ھ میں احسن المطالع، مدراس سے شائع ہو کر بہت مقبول ہوئی تھی۔ دیگر تصنیفات میں ”محاسن الاعمال“ اور ”المقاصد“ کو کافی شہرت حاصل ہوئی۔

حضرت فخر شعر و سخن کا اعلیٰ ذوق رکھتے تھے، خصوصاً تاریخ گوئی میں اپنی مثال آپ تھے۔ انہوں نے متعدد واقعات و مختلف تقریبات کے مواقع پر تاریخی قطعے بڑی ہنرمندی سے کہے۔ جن میں مدرسہ باقیات کی عمارت کے مکمل ہونے پر کہا گیا قطعہ بالخصوص دلچسپ اور قابل توجہ ہے۔ اس تاریخ میں بیک وقت صنعت تخریج اور صنعت منقوطہ دونوں کا استعمال انتہائی چابک دستی سے کیا گیا ہے، اس کے چند شعر ملاحظہ ہوں۔

صدائے حبذا یا للفرح از شش جہات آمد      وجودش بالیقین سرچشمہ آبِ حیات آمد  
سر حاسد فدا شد چو پئے منقوطہ تاریخش      ندا از غیب ”تک الباقیات الصالحات“ آمد  
(تیرہ سو چار) ۱۳۰۴ھ: ۸-۱۳۱۲

۸

علاوہ ازیں انہوں نے اپنے برادر خورد مشہور شاعر مولانا عبدالقدوس ضوویلیوری (متوفی ۱۳۶۵ھ) کے ضخیم دیوان کی طباعت پر بہترین و موزوں قطعہ تاریخ کہا تھا جس میں ایک لطیف اشارے سے تخریج کے عمل کو بروئے کار لاتے ہوئے مطلوبہ سن کا استخراج کیا ہے۔

ہو گیا طبع جو دیوانِ ضو      ہوا سرسبز گلستانِ سخن  
فخر سے سر کو اٹھا کے ہاتفِ سال      بولا ”چہستانِ سخن“  
(تیرہ سو نو) ۱۳۰۹ھ: ۵-۱۳۱۲

۵

حضرت فخر کی قادر الکلامی کا ایک اور ثبوت مدرسہ باقیات کی مسجد کے محراب پر نصب شدہ سنگین کتبہ کا وہ تاریخی قطعہ ہے، جس میں انہوں نے بنائے مسجد کی تاریخ محل وقوع سے کامل مناسبت رکھنے والی آیت کریمہ سے الف جمع کو حذف کرتے ہوئے استنباط کی ہے۔

لہ الحمد خوشا مسجدِ فرخِ منظر      کہ ندید است گہے چشمِ فلک تملالش  
حبذا در دلم از عالمِ قدس القا شد      ”اذکرو اللہ قیاماً و قعوداً“ سالش  
(تیرہ سو بیس) ۳۲ ھ ۱۳

فن تاریخ گوئی میں ان کے کمال کا اعتراف کرتے ہوئے فخر الشعراء حضرت علمی نے

درج ذیل شعر کہا تھا:

شیخ در تاریخ گوئی گوئے سبقت بردہ است      یا سیمین باقیات از مرگ او پڑ مرده است  
(”ترکیب بند“)

مذکورہ شواہد کی روشنی میں ہم یہ دعویٰ کرنے میں حق بجانب ہیں کہ ان کی تاریخیں ان شاء اللہ تاقیامت، زندہ و تابندہ اور یادگار زمانہ رہیں گی۔

حضرت شا کروانمباڑیؒ: مولانا شاہ گنڈ محمد عبدالقادر (ولادت ۱۲۸۲ھ وفات ۱۳۴۱ھ) وانمباڑی کے متوطن تھے۔ ان کا شمار ام المدارس مدرسہ باقیات صالحات کے بانی و مؤسس بنس العلماء اعلیٰ حضرت شاہ عبدالوہاب قادری دلیوری (۱۳۳۷-۱۲۴۷ھ) کے ممتاز و معروف شاگردوں اور خلفاء میں ہوتا ہے۔ عالم و صوفی ہونے کے علاوہ بلند پایہ شاعر، صاحب طرز ادیب اور نقاد سخن بھی تھے۔ انہوں نے حضرت داغ دہلوی (متوفی ۱۳۲۲ھ) کی زمین میں سترہ (۱۷) شعر کی ایک طویل غزل کہی اور اپنے استاذ مولانا حافظ محمد یعقوب خاں مدہوش کے ساتھ مسوری (دہرہ دون) پہنچ کر حضرت داغ کی خدمت میں بالمشافہ سنائی۔ حضرت داغ ان دنوں تفریح کے لیے ہل اسٹیشن مسوری میں تشریف فرما تھے اور حضرت شا کر کی دہرہ دون آمد بغرض تجارت ہوئی تھی۔ شا کر کی زبانی غزل سن کر داغ نے بے ساختہ کہا ”جب مدراسیوں میں یہ زور کلام ہے تو ہم اہل زبان کیا دعویٰ کر سکتے ہیں“۔ ایک اور موقع پر انہوں نے حضرت امیر مینائی کی طرح پر غزل لکھ کر ایک خط ان کی خدمت میں روانہ کیا۔ امیر مینائی نے خط کا جواب دیتے ہوئے تحریر فرمایا ”مدراسی کا ایسا کلام دلکش دیکھ کر ہم اپنے لکھنوی کہتے ہوئے شرماتے ہیں، غزل بہت خوب ہے (تحفہ شا کر مرتبہ عبدالرحیم طاہر مطبوعہ ۱۳۲۷ھ مطبع گلزار حسنی، بمبئی۔ ۵) حضرت شا کر نے نظم و نثر میں جملہ اٹھارہ (۱۸) کتابیں تصنیف کیں، جن میں ”مثنوی گلزار شا کر“ (مطبوعہ ۱۳۲۶ھ مطبع شوکت الاسلام، بنگلور) کو ہندوستان گیر شہرت حاصل ہوئی۔ اس مثنوی میں انہوں نے دکن کی مشہور عشقیہ داستان ”چندر بدن مہیار“ کو صوفیانہ طرز پر بڑی عمدگی اور شگفتگی کے ساتھ نظم کیا ہے۔ حضرت شا کر کو تاریخ گوئی میں بھی ید طولیٰ حاصل تھا، انہوں نے متعدد تاریخی قطعات رقم کیے ہیں، یہاں مشہور شاعر و ادیب خطیب قادر بادشاہ وانمباڑی (متوفی ۱۳۳۳ھ) کے وصال پر کہی گئی نظم کے چند شعر بطور نمونہ پیش کئے جا رہے ہیں۔

محسنی الحاج قادر بادشاہ دارِ دنیا سے لئے عقبیٰ کی راہ  
شاعر خوش فکر و مداح رسول صاحب دیواں تخلص بادشاہ  
تھے وہ خلق اللہ میں ہر دل عزیز سب کو تھی اس یوسف مصری کی چاہ  
آپ کی تاریخ شاکر نے کہی ”خلد پہنچے آج قادر بادشاہ“  
(تیرہ سو تینیس) ۱۳۳۳ھ

حضرت شاکر نے اپنا رسالہ ”عون الی فی اثبات ذکر الحلی“ کے آخر میں تاریخ  
تصنیف بیان کرتے ہوئے درج ذیل شعر رقم کیے ہیں، جن میں مخالفین ذکر جلی کے لیے برملا  
تنبیہ اور بر محل نصیحت کی گئی ہے۔

جھگڑا ہے کیا تمہارا خدا و رسول سے کیا علم کا نتیجہ یہی زہر مار ہے  
ذکر جلی و حلقہ ہے ثابت کتاب سے جھٹلانا اس کا رشک و حسد پر مدار ہے  
تاریخ اس رسالے کی شاکر بشان مہر کہہ دے کہ ”ماہ سیمہ صداقت شعار ہے“  
(تیرہ سو اڑتیس) ۱۳۳۸ھ

ایک اور تصنیف ”صحیفہ ذکر اللہ“ کے اختتام پر طویل تاریخی قطعہ تحریر فرمایا، جس کے  
آخری دو شعر اس طرح ہیں۔

تاریخ اس کی شاکر خوش فکر سے سنو وہ تو خدا کے فضل سے روشن ضمیر ہے  
”پائے حسد“ کو کر دیا جس وقت پائے مال بولا فلک ”صحیفہ ذکر قدیر“ ہے  
(تیرہ سو اڑتیس) ۱۳۳۸ھ-۸۸ (۱۲۲۳) ۸۵

مذکورہ بالا آخری شعر میں تاریخ گوئی کی ایک قسم صنعت ”تخریجہ“ کا استعمال کرتے  
ہوئے مطلوبہ اعداد کا استخراج بڑی عمدگی سے کیا گیا ہے۔

حضرت ایمان گوپا منوی: حضرت ایمان (ولادت ۱۲۷۷ھ وفات ۱۳۵۹ھ) کا اسم گرامی  
نواب سراج العلماء خان بہادر راجہ حسین فاروقی اور تخلص ایمان گوپا منوی ہے، والد بزرگوار حافظ  
شاہ ولی احمد چشتی قادری صفوی کا وصال ۱۲۶۱ھ میں اچانک ہوا جبکہ وہ سولہ سال کے تھے، اس  
جانکاہ حادثے سے ان کا دل بیٹھ گیا، اس لیے وطن عزیز گوپا منو (یوپی) سے ہجرت کرنے کی ٹھان

لی۔ حیدر آباد دکن میں ان کے ایک عزیز محسن الملک منصب وزارت پر فائز تھے، اس لیے اپنی والدہ ماجدہ کو ساتھ لے کر حیدر آباد پہنچے، اور محسن الملک کی سرپرستی میں تعلیمی مراحل طے کرنے لگے۔ مگر اتفاق ایسا ہوا کہ جب وہ اپنے چچا رفعت الملک بہادر (داماد نواب عظیم جاہ بہادر اولین پرنس آف آرکاٹ، متوفی ۱۲۹۰ھ) سے ملاقات کی غرض سے وارد مدراس ہوئے تو چچا صاحب کے اصرار پر مدراس ہی کو اپنا وطن ثانی بنالیا، ۲۳ سال کی عمر میں نواب انتظام الملک بہادر (پرنس آف آرکاٹ سوم) کی دختر نیک اختر سے ان کا نکاح ہوا اور آخر کار ۸۲ سال کی عمر میں مدراس ہی میں آسودہ خاک ہو گئے۔

حضرت ایمان نے جہاں علمائے مدراس سے علمی استفادہ کیا وہیں شمس العلماء شاہ عبدالوہاب صاحب بانی باقیات سے بھی علم حدیث و علم تصوف میں خوب فیض پایا اور حضرت بانی کے دست حق پرست پر بیعت سے مشرف ہو کر خرقہ و خلافت حاصل فرمایا۔ نوابین کے خاندان سے وابستہ اور رؤسائے وقت کی صف اول میں شامل ہونے کے باوجود بڑے ہی منکسر المزاج اور انتہائی متواضع تھے، جس کی وجہ سے تمام طبقات میں عزت و احترام کی نگاہوں سے دیکھے جاتے تھے۔

حضرت ایمان کی طبیعت میں بلا کی موزونیت تھی، فکر سخن کے وقت تخلیقی صلاحیتوں کے سرچشمے جاری ہو جاتے۔ انہوں نے اس دور کے مشہور استاذ حضرت سید ضامن علی جلال لکھنوی سے شرف تلمذ حاصل کیا اور استاذ محترم سے ملاقات کے لیے کئی مرتبہ لکھنؤ اور رامپور کا سفر بھی کیا۔ نثری تصنیفات میں بارہ کتابوں کا پتہ چلتا ہے جن میں ”ابتناج فی ذکر الحسین بن منصور الحلج“ (تذکرہ، مطبوعہ ۱۲۸۴ھ مطبع غوثیہ، مدراس) اور عقائد ایمان (مطبوعہ ۱۳۳۲ھ) کافی مشہور ہیں۔ شعری تخلیقات میں غزلیات کا دیوان (مخطوطہ) مثنوی ”اشتیاق نامہ“ (مطبوعہ ۱۳۰۲ھ) اور قصائد ایمان (مطبوعہ ۱۳۷۲ھ) قابل ذکر ہیں۔

تاریخ گوئی میں بھی قدرت کاملہ حاصل تھی، مختلف مواقع پر لا جواب تاریخی قطعات کہے ہیں، ان میں بطور نمونہ یہاں وہ قطعہ تاریخ پیش کیا جا رہا ہے، جسے حضرت علامہ ضیاء الدین امائی کے منتخب فارسی دیوان کی طباعت (۱۳۳۷ھ مطبع الحمیدیہ، مدراس) کے موقع پر تحریر فرمایا تھا۔

نتائج ہائے افکار ضیاء الدین احمد ہیں کہ یک یک بیت از دیوان او بیت الغزل آمد

رقم زد مصرع تاریخ طبعش خامہ ایماں ”زدیوانِ امائی انتخاب بے بدل آمد“

(تیرہ سو ستائیس) ۱۳۲۷ھ

(سالنامہ نفیر ویلور شمارہ ۱ ص ۴۸)

اس بات کا تذکرہ دلچسپی سے خالی نہیں ہوگا کہ ان کی وفات کے بارہ سال بعد ان کی لائق وفاق دختر محترمہ امۃ الحجی حیا کی مساعی جمیلہ سے ان کا دیوان قصائد (اردو) ۱۳۷۲ھ میں طبع ہوا تو جناب سید ابوالبرکات انور نے تاریخی نظم کہی تھی، اس کے آخر کے تین خوبصورت شعر ملاحظہ ہوں جس سے ان کے شاگردوں میں موجود جذبہ تاریخ گوئی کا کمال ظاہر ہوتا ہے۔

اقتباس آپ کے شیریں کلام کا جو حضرت حیا کی مساعی کی ہے مثال  
سرمایہ زباں بھی ہے، نعت رسولؐ بھی اس کو پڑھے ہر ایک جواں، پیرو خرد سال  
انور سے فی البدیہ کہا جبرئیل نے ”نذر رسولؐ، ہدیہ ایماں“ ہے اس کا سال

(تیرہ سو بہتر) ۱۳۷۲ھ

(عقائد ایمان مطبوعہ ۱۳۳۷ھ مدینہ پریس، مدراس)

حضرت سفیر بلنج پوریؒ: حضرت مولانا قاضی خطیب محمد اعظم سفیر بلنج پوری فرزند حضرت مولانا قاضی خطیب محمد یعقوب کا وطن مالوف شہر ویلور سے تقریباً بارہ کلومیٹر دور شمالی سمت میں واقع ایک چھوٹا سا مگر مردم خیز قصبہ ”بلنج پور“ (Viranjipuram) ہے جو اس لیے بھی تاریخ کے حافظہ کا حصہ بن چکا ہے کہ وہاں ۱۱۴۱ھ/۱۷۲۶ء کو سلطنت بیجا پور کے سپہ سالار ”مصطفیٰ خاں“ اور آثار و جیا نگر کے وارث و قلعہ دار ویلور سری رنگ (سوم) کے درمیان زبردست جنگ ہوئی تھی جس میں ”خان موصوف فتح یاب ہوا تھا، (ویلور تاریخ کے آئینہ میں از ڈاکٹر راہی فدائی)۔ حضرت سفیر اس مختصر آبادی کی دینی و ملی ضروریات کی تکمیل کرنے کے علاوہ شعرو سخن کی آبیاری اور علم و ادب کی چمن بندی میں بھی اپنا قیمتی وقت صرف کیا کرتے تھے۔

حضرت سفیر کی تعلیم و تربیت کا سفر اعلیٰ حضرت شاہ عبدالوہاب ویلوری (۱۸۳۱ء-۱۹۱۹ء)

کی سرپرستی میں فراغت تک جاری رہا، جس سے ان کے اندر منزل مقصود کا عرفان اور مزاج میں جودت طبع و وسعت فکر کی اعلیٰ شان پیدا ہو گئی۔ اس کا اعتراف کرتے ہوئے بڑے ہی انکسار کے

ساتھ فرمایا۔

تلمیذ ایک ادنیٰ ہوں میں اس جناب کا ذرہ ہوں گرچہ پایا ہوں فیض آفتاب کا  
شعر و ادب کا شستہ و شاستہ ذوق رکھتے تھے، ”مخزن اعظم“ کے نام سے اپنا نعتیہ مجموعہ دو  
جلدوں میں مطبع شوکت الاسلام، بنگلور سے شائع فرمایا اور ”چمنستان اعظم“ کے عنوان سے قصائد  
کے دو مجموعے مذکورہ مطبع ہی سے چھپوائے تھے۔ ان کے ایک شاگرد جناب وی محمد عبداللطیف  
صاحب ولد جناب وی محمد یعقوب صاحب مرحوم نے ان کے قصائد کا ایک اور مجموعہ ”خیابان  
لطیف“ ۱۳۳۴ھ میں مذکورہ مطبع ہی سے شائع کروایا تھا، علاوہ ازیں ان کی ایک گراں قدر نثری  
تصنیف ”فتح الودود فی اثبات المولود“ مطبع رزاقی، کانپور سے ۱۳۱۷ھ میں بڑی تقطیع پر شائع ہوئی  
تھی۔ ان کا فارسی کلام نایاب ہے مگر ”فتح الودود“ میں ایک نعتیہ رباعی محفوظ ہوگئی ہے جو ہدیہ  
ناظرین کی جارہی ہے:

اے ختم رسلؐ شاہ کونین توئی سرّ دو جہان و درّ بحرین توئی  
ہر شب ملک از فلک زمیں بوس کند شاہنشہ قاب قوسین توئی  
تاریخ گوئی میں بھی مہارت حاصل تھی، چنانچہ اپنے استاذ اعلیٰ حضرت کی وفات حسرت  
آیات پر ایسی عمدہ تاریخیں کہی ہیں جس سے ان کی قادر الکلامی ثابت ہوتی ہے۔ ملاحظہ ہو:

شمس علماء مولوی عبدالوہاب خدمتِ دینی سے پایا جب فراغ  
چل بسے دنیا سے وہ ملک بقا کر عطا مولیٰ انہیں جنت کا باغ  
بزمِ علما میں یہی ہے گفتگو حیف، دل پر ہے ہمارے ان کا داغ  
کہہ دیا ہاتھ سفیر اب سال فوت ”ہو گیا ہے آہ گل زیبا چراغ“

(تیرہ سو سنیتیں) ۳۷ ھ ۱۳

شمسِ علما عارف و ہادی و مفتی نامدار اس جہاں سے عازمِ گلزارِ رضواں ہو گیا  
جس وجود پاک سے پائے تھے فیضانِ علوم آہ، اس کے فوت سے تاریک دوراں ہو گیا  
بست و دوم تھی ربيعِ آخر کی، وقتِ شام وائے حسرت، داخلِ شہرِ خموشاں ہو گیا  
سالِ رحلت کہہ دیا ہاتھ سفیرانی البدیہہ ”آفتاب“ مجمع الحسنات، پنہاں ہو گیا“

(تیرہ سوئیتیس) ۱۳۷۷ھ

(”نغان اعظم“، مطبوعہ ۱۳۳۷ھ مطبع شوکت الاسلام، بنگلور، من جانب اہل اسلام، بلخ پور)  
حضرت شاہ اسماعیل ویلوریؒ: حضرت حکیم شاہ محمد اسماعیل ویلوری حضرت سفیر بلخ پوری کے ہم عصر وہم ذوق تھے، انہوں نے اپنے والد بزرگوار حضرت شاہ محمد لطف اللہ ویلوری کی سرپرستی میں ابتدائی تعلیم حاصل کی، بعد ازاں اعلیٰ حضرت بانی مدرسہ باقیات صالحات علیہ الرحمہ کی خدمت میں باریاب ہو کر علوم متداولہ سے فیضیاب ہوئے۔ حضرت بانی مدرسہ نے چونکہ شہر ویلور کے نامور حکیم حضرت علامہ زین العابدین مائل ویلوری سے فن طب و حکمت میں مہارت حاصل کی تھی۔ اس لیے شاہ اسماعیل نے حضرت بانی ہی کو علم طب کے حصول کے سلسلہ میں اپنا رہبر و رہنما بنالیا۔ چنانچہ تعلیم طب سے فراغت کے بعد حضرت بانی نے شاہ اسماعیل کو مشورہ دیا کہ وہ تروپتی (آندھرا) جا کر دعوت و ارشاد کی ذمہ داری نبھاتے ہوئے طب یونانی کے ذریعہ خلق اللہ کی خدمت کا فریضہ انجام دیں۔

حضرت اسماعیل نے اپنے استاذ و شیخ کے انتقال پر ”فراق نامہ فخر العلماء“ کے تاریخی نام سے ایک طویل مثنوی تحریر کی تھی جس میں وفات کی متعدد تاریخیں کہی ہیں ان قطعات کے ملاحظہ سے اس فن میں ان کی مہارت کا پتہ چلتا ہے۔

سال	ترحیل	شاہ	عبد	وہاب
ہاتفِ جاں	کیا	ہے	دل	سے
سال	یہ	باعث	کروب	ہوا

جستجو میں نے کی بوجہ صواب

سوائے جنت شمسِ علما، ہادیٰ راہِ ہدیٰ  
عالم بالا سے سالِ عیسوی در فوت شیخ  
”غاب قطب الوقت ویلوری بجا“ آئی ندا  
سوائے جنت شمسِ علما، ہادیٰ راہِ ہدیٰ

(تیرہ سوئیتیس) ۱۳۷۷ھ

(انیس سو انیس) ۱۹ ء ۱۹

شاہ صاحب نے مذکورہ بالا قطعے میں بہترین سن عیسوی برآمد کیا ہے جس سے فن تاریخ گوئی پران کی دسترس کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔



ہوا جب راہی فردوس قطب الہند شیخ الوقت بہایا شک آنکھوں سے ہر اک خرد وکلاں ہے ہے  
ندا آئی فلک سے از پئے منقوطہ سال وصل ”فراق فخر علما، ماتم اہل زماں ہے ہے“

(تیرہ سوینتیس) ۱۳۳۷ھ

شاہ اسماعیل نے مذکورہ بالا قطعے میں مصرع اخیر کے حروف منقوطہ سے مطلوب تاریخ کا  
اخراج بڑے کمال فن کے ساتھ کیا ہے۔

کر قلم راس الم لے سال فوت ” فخر ہند اب قدسیاں سے مل گیا“

(تیرہ سوینتیس) ۱۳۳۷ھ-۱۳۳۸ھ

اوپر ذکر کردہ شعر کی خوبصورتی دیکھئے کہ کس نرالے اور لطیف انداز میں الم الف کے  
عدد ایک کو منہا کر کے سال وصال نکالا گیا ہے، اس طرح کا شعر فن پر مکمل قدرت کے بغیر ممکن  
نہیں۔ شاہ صاحب کو فارسی اور عربی میں تاریخ گوئی پر بھی کامل درک حاصل تھا، یہاں نمونہ اس  
کا ذکر بحل نہ ہوگا۔

ملہم غیب گفت سال وصال ” غاب قطب زماں ، ولی دکن“

(تیرہ سوینتیس) ۳۷ ھ ۱۳

فکر تاریخ وصالش کردہ ام چہ شود از ہاتف دل مستبیں

ناگہاں آمد ندا در گوش من بَوْنَ قُطْبِ الْهِنْدِ شَيْخِ الْعَابِدِينَ

(تیرہ سوینتیس) ۳۷ ھ ۱۳

حضرت مولانا شاہ عبدالرحیم ویلوری: حضرت مولانا شاہ عبدالرحیم باقوی قاسمی ویلوری

(ولادت ۱۳۰۲ھ وفات ۱۳۶۷ھ)۔ شیخ طریقت و شیخ الحدیث و مہتمم (ناظر ثالث) مدرسہ

باقیات صالحات کو اعلیٰ حضرت بانی علیہ الرحمہ کے علاوہ مولانا غلام محی الدین، مولانا عبدالقادر

بادشاہ، علامہ شمس العلماء عبدالجبار، مفتی اعظم شیخ آدم اور بہنوئی مولانا کمال الدین سے شرف

تلمذ حاصل تھا۔ اپنے دوست مولانا عبدالکریم (بانی مدرسہ مصباح الہدیٰ، نیڈور، تمل ناڈو) کے

ہمراہ ۱۳۲۱ھ میں دارالعلوم دیوبند تشریف لے گئے جہاں سے مکمل چھ سال بعد ۱۳۳۰ھ میں ویلور

لوٹ آئے، بعد ازاں حضرت ناظر ثانی علامہ قاری ضیاء الدین محمد فرزند اعلیٰ حضرت بانی باقیات نے

اپنی سرپرستی میں لیتے ہوئے ۱۳۳۱ھ میں ان کا تقرر بحیثیت استاذ مدرسہ کر دیا۔ اور شرف دامادی بھی بخشا۔ بڑے ہی منکسر المزاج اور انتہائی متواضع تھے۔ طبیعت میں غنائے نفس اور توکل کا جذبہ غالب تھا۔ رواداری و پرہیزگاری امتیازی شان تھی۔ دارالعلوم سے فراغت کے بعد بانی مدرسہ علیہ الرحمہ سے تصوف کے اعلیٰ درجہ کی کتابیں پڑھی تھیں۔ اور مدرسہ کا نصاب مطول مکمل کیا تھا۔ اسی لیے اختلافی مسائل میں ہمیشہ اعتدال کی راہ پر گامزن رہے۔ باقاعدہ شاعر تو نہیں تھے، مگر اپنے شاگردوں میں شعری ذوق اور ادب سے دلچسپی پیدا کرنے میں سرگرم عمل رہا کرتے تھے۔ نسبتی برادر محترم نور الدین احمد عرف بادشاہ (ولادت ۱۳۲۱ھ وفات ۱۳۴۶ھ) پدر بزرگوار حضرت مولانا الحاج رئیس الاسلام صاحب باقوی سابق مدرس مدرسہ باقیات (متوفی ۱۴۳۳ھ) کے نکاح پر فلاح منعقدہ ۲۲/ذی الحجہ ۱۳۳۹ھ کے مبارک موقع پر ان کے ایک عزیز شاگرد مولانا محمد تمیم ملبیری نے ایک طویل تہنیت نامہ بزبان عربی رقم کیا تھا، جس میں انہوں نے شادی کی عمدہ تاریخ نکالی تھی، اس سے فن تاریخ گوئی میں موصوف کے کمال درک کا اظہار ہوتا ہے۔ یہاں صرف دو شعر نقل کیے جا رہے ہیں جس میں دولہے کے نام ”نور الدین“ کون تاریخ کا جزء بنایا گیا ہے:

تَفَكَّرْتُ فِي تَارِيخِ عَقْدِ نِكَاحِهِ بِمُصْرَاعِ بَيْتٍ مِنْ قَوَاعِدِ أَبْجَدٍ  
هَنِيئًا لِنُورِ الدِّينِ بِالْخَيْرِ وَالْبَهَا وَنَيْفٍ عَلَيْهِ الْخَمْسُ فَوْرًا وَعَدَدٍ  
(تیرہ سو انچالیس) ۱۳۳۹ + ۵ = ۱۳۳۴

۵

ایک اور شعر میں مولانا تمیم صاحب نے نکاح کے دن اور مہینے کی بھی الفاظ میں صراحت کر دی ہے، ملاحظہ ہو:

بِطَالِعِ سَعْدٍ يَوْمَ أَحَدٍ بِسَادِسٍ وَعَشْرَيْنَ مِنْ ذِي الْحِجِّ شَهْرٍ مُسَعَّدٍ  
آخر میں شاعر موصوف نے اپنے نام کو اس طرح بیان کیا ہے:

أَنَا النَّازِلُ الْعَاصِي الْفَقِيرُ مُحَمَّدٌ تَمِيمٌ هَدَاهُ اللَّهُ مَسْلَكَ رُشْدٍ

مولانا محمد تمیم نے اپنے استاذ گرامی حضرت شمس العلماء ابوالجلال محمد غلام محی الدین آتوری (صدر مدرس مدرسہ باقیات) برادرزادہ اعلیٰ حضرت بانی علیہ الرحمہ کے انتقال پر ملال پر تقریباً اسی (۸۰) اشعار پر مشتمل فصیح و بلیغ تعزیتی نظم تحریر کی تھی۔ جس کے آخر میں درج ذیل بے مثال قطعہ

تاریخ رقم کیا ہے۔ اشعار کے مطالعے سے زور قلم اور فنی مہارت کا ادراک ہوتا ہے:

وَذَاكَ شَيْخٌ تَسْمَى بِاسْمِهِ الْأَسْمَى      غَلَامٌ مُحْيٍ لِدَيْنٍ طَابَ عُتْوَانَا  
صَبِيحَةَ الْيَوْمِ الْإِثْنَيْنِ قَدْ قُبِضَا      فَفَارَقَ الْأَهْلَ وَالْأَوْلَادَ أَوْطَانَا  
فَرَّاحَ رَوْحٍ لَهُ فِي أَوَّلِ الصَّفْرِ      فِي عَامٍ نَالَ نَعِيمًا زَادَ رِضْوَانَا  
(تیرہ سو بائیس) ۱۳۲۲ھ

مرثیہ کے آخر میں انہوں نے اپنا تخلص بیان کرتے ہوئے دعائیہ شعراں طرح کہا ہے:

إِنِّي تَوَيْمٌ إِلَهِي تَمَمَّنْ أَمَلِي      دِينًا وَدُنْيَا وَلَا تَجْعَلْهُ مَجَانَا  
(تذکرۃ ابوالجلال مصنف ابوالکمال مولانا محمد حبیب اللہ باقوی ندوی مطبوعہ ۱۳۴۵ھ مطابق ۱۹۲۷ء  
مطبع علوی آمبور)

حضرت سعید صاحب قبلہ: حضرت علامہ سید محمد سعید و شارمی (متوفی ۱۳۹۳ھ) سابق مدرس مدرسہ باقیات صالحات، ویلور، اعلیٰ حضرت بانی علیہ الرحمہ کے تلمیذ رشید تھے، ایک جید عالم ہونے کے ساتھ باتصرف بزرگ اور عامل باکمال بھی تھے، خلق خدا کی ایک کثیر تعداد فیوض و برکات سے استفادہ کرتی رہی، ۱۹۶۰ء کا واقعہ ہے کہ چند تلامذہ نے جن میں مولانا عبدالغفور باقوی (بانی و مہتمم دارالعلوم فاروقیہ عربک کالج، کولار)، مولانا حلیم اللہ بیگ باقوی (بانی و مہتمم مدرسہ دارالفلاح، رحمت نگر، بنگلور)، مولانا کلیم اللہ بیگ باقوی (سابق مدرس دارالعلوم سبیل الرشاد، بنگلور) شامل تھے اور مدرسہ میں جماعت سوم میں زیر تعلیم تھے۔ بغرض استفادہ سوال کیا کہ حضرت! کیا اور ادو وظائف سے اس دنیائے دارالاسباب میں کوئی غیر معمولی فرق پڑتا ہے؟ اس پر حضرت والا نے عبدالغفور صاحب سے فرمایا کہ مدرسہ کے مطبخ (کچن) سے کونکہ کا ایک ٹکڑا لے آئیں اور سامنے پڑی ہوئی پتھر کی سل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ اس کے درمیان کونکہ کی لکیر کھینچیں، چنانچہ موصوف نے حضرت کے حکم کی تعمیل کی، بعد ازاں وہ ایک طرف کھڑے ہو گئے اور ہاتھ میں تسبیح لے کر کچھ پڑھتے ہوئے آہستہ آہستہ دوسری طرف آ گئے، طلبہ نے دیکھا کہ جہاں لکیر تھی وہاں اب چٹان کے پھٹ جانے سے دراڑ پڑ گئی ہے۔ یہ منظر دیکھ کر شاگرد مبہوت رہ گئے اور حضرت قبلہ کے تصرف باطنی کے قائل ہو گئے۔ سادگی اور بے لوثی اوصاف حمیدہ میں نمایاں تھی۔

شعر و سخن سے دلچسپی تو تھی مگر شعر گوئی کی عادت نہیں تھی۔ البتہ وقت ضرورت اشعار بے تکلف کہتے تھے، تاریخ گوئی میں خاصہ ملکہ حاصل تھا، نظم کے علاوہ نثری جملوں سے بھی بے ساختہ تاریخ برآمد کرتے تھے، حضرت بانی علیہ الرحمہ کے فرزند حضرت خان بہادر علامہ قاری ضیاء الدین محمد کے انتقال پر ملال پر ”اظہار رنج“ (۶۰ھ ۱۳) کے تاریخی عنوان سے ایک مرثیہ تحریر کیا تھا جو مطبع محمدی ترمکھڑی (Triplicane)، مدراس، سے ۱۹۴۱ء میں طبع ہوا۔ مذکورہ نظم کی ابتداء میں اعلیٰ حضرت ثانی مولانا مرحوم کے نام نامی سے ہجری سال وصال اور ان کے منصب کے ذکر سے عیسوی سن رحلت کا بخوبی استخراج کیا ہے جس سے اس فن میں ان کے کمال کا اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے۔

”الحاج ضیاء الدین محمد رحمہ اللہ“ ”ناظر جلیل القدر دارالعلوم“  
(تیرہ سو ساٹھ) ۶۰ ھ ۱۳ (ایک ہزار نو سو اکتالیس) ۴۱ ھ ۱۹

مرثیہ کے آخری دو شعر اس طرح ہیں:

مرقد اقدس پہ ان کے سائبان رحمت ہوئی ذوالمنن کی خلد میں قربت ہوئی، رویت ہوئی  
”رحمت یزداں ضیاء الدین محمد پر ہوئی“ کہہ دیا ملہم نے سن، ترحیل جس ساعت ہوئی  
(انیسویں سو اکتالیس) ۴۱ ھ ۱۹

مولانا محمد بشیر منجیریؒ: یہ مدرسہ باقیات کے فاضلین میں سے تھے، فراغت کے بعد مدرسہ منبع الہدیٰ، کوتانلور (تمل ناڈو) میں ایک مدت تک تعلیم و تدریس کے فرائض انجام دیتے رہے، پھر وطن عزیز ملیبارہی میں مستقل سکونت اختیار کر لی تھی۔ ان کا شمار کیرلا کے ممتاز علماء و صلحاء میں ہوتا ہے۔ دوران تعلیم ہی سے شاعری کا صالح ذوق رہا ہے۔ اپنے مشفق استاذ و ناظر مدرسہ حضرت علامہ مفتی اعظم شیخ آدم کی وفات حسرت آیات پر عربی میں ایک پُر اثر مرثیہ لکھا تھا، جس میں بڑے ہی سلیقہ اور انتہائی مہارت سے تاریخ وفات نکالی تھی۔ یہاں اس مرثیہ کے چند منتخب شعر پیش کیے جا رہے ہیں:

واللہ یعلم ما فی القلب من الم من غیب شمس الہدیٰ والدین والعلم  
والموت یشملنا والقبر یجمعنا والعمل یتبعنا والباقی کالعدم

ومنہم ولی نور العلم والعمل وداوم تبلیغ العلوم مع الحکم  
اعنی بہ شیخ الشیوخ شیخنا شیخ آدم حضرت قدس اللہ سرہم  
تاریخہ ”غفر اللہ لہ“ حازا واللہ یجمعنا فی جنة النعم  
(تیرہ سواکیاسی) ۸۱ ھ ۱۳

حضرت مفتی اعظم شیخ آدم کا سال وفات درحقیقت ۱۳۸۰ھ ہے، مذکورہ مصرعے میں  
ایک عدد کی زیادتی بشری تسامح کی واضح دلیل ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔  
حضرت علامہ علمی باقوی: حضرت علامہ فخر الشعراء حافظ قاری الحاج عبدالصمد (متوفی  
۱۳۶۵ھ مطابق ۱۹۴۶ء) کا وطن مالوف شہر مدراس کے مضافات میں واقع قبضہ ”پٹ“ ہے۔  
انہوں نے اعلیٰ حضرت بانی باقیات علیہ الرحمہ کے علاوہ شیخ المعقولات شمس العلماء شیخ عبدالجبار  
صاحب باقوی (متوفی ۱۳۵۳ھ) حضرت مفتی اعظم شیخ آدم باقوی (متوفی ۱۳۸۰ھ)، شیخ التفسیر  
علامہ حسن باشا باقوی (متوفی ۱۳۷۳ھ)، شیخ الحدیث حضرت مولانا عبدالرحیم صاحب باقوی قاسمی  
(متوفی ۱۳۶۷ھ) سے بھی شرف تلمذ حاصل کیا، بعد ازاں ان کی صلاحیتوں کے مد نظر اعلیٰ حضرت  
نے مدرسہ باقیات میں نہ صرف منصب تدریس پر فائز فرمایا بلکہ خرقہ خلافت سے بھی نوازا۔

عربی، فارسی اور اردو زبان و ادب کے ماہر تھے مذکورہ تینوں زبانوں میں خوب طبع آزمائی  
کی، چنانچہ مثنویاں لکھیں، قصیدے اور مرثیہ رقم کیے۔ ”لامیۃ علمی“، القصیدۃ البائیۃ (مطبوعہ  
۱۳۵۵ھ در مطبع حقانی مدراس) ”دالۃ علمی“، سمستان، ردّ ملحد رحلت شیخ ویلور وغیرہ کتب و رسائل  
یادگار ہیں۔ فن تاریخ گوئی میں ید طولیٰ حاصل تھا، اپنے شیخ کی وفات پر جو تاریخیں کہی ہیں انہیں  
دیکھتے ہوئے یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اس فن کے امام تھے۔ یہاں چند منتخب شعر پیش کیے جا رہے ہیں:

ہر غم کی اس قدر ہے کہاں طاقت و مجال جو وہ کرے جہاں کو پراگندہ حال و قال  
ہر موت پر تو خلق بہاتی نہیں ہے اشک ہر فوت سے ہوتی نہیں آنکھیں خوں سے لال  
وہ انتقال ہوش ربا ہے اگر کہیں ہے انتقال شیخ جو تھا قوم کا مال  
اس غم سے جملہ خلق بنے نوحہ خواں، بجا اس غم سے لوگ دل کو کریں شق تو حسب حال  
باتف نے مجھ کو درد و غم و رنج سے کہا ”خورشید علم آہ ہوا ہے زوال“ سال

(تیرہ سوئیتیس) ۳۷ ھ ۱۳

اعلیٰ حضرت کے یوم زیارت کے موقع پر منعقدہ جلسہ تعزیت میں پڑھا گیا قطعہ درج ذیل ہے:

علم کی خدمت میں اس نے عمر اپنی صرف کی      آج ہے یہ ”باقیات صالحات“ اس کی مثال  
سن کے ہاتف کی زبانی دل سے میں غمگیں ہوا      ”شمسِ علما کی زیارت جلوہ افزا ہے“ یہ سال

(تیرہ سوئیتیس) ۳۷ ھ ۱۳

ایک اور قطعہ جس میں کمال ہنر کا جلوہ صاف نظر آ رہا ہے، نذر قارئین ہے:

رحلتِ فخرِ زماں سے افسوس ہو گیا راغ وہ باغِ دیں آج  
جرعہٴ علم و شرابِ حق سے ہوئے خالی ہیں ایامِ دیں آج  
ہجر سے اس کے زمیں سے دردا متحیر ہے دماغِ دیں آج  
سالِ تاریخِ ہوائف سے سنا ”بجھ گیا کاج چراغِ دیں آج“

(تیرہ سوئیتیس) ۳۷ ھ ۱۳

عیسوی تاریخ پر مشتمل قطعہ تاریخ ملاحظہ ہو:

شمسِ علما جب ہوئے ہیں رائی دار البقا      درد و غم دنیا میں پھیلے اور ہیں آئے کروب  
شیونی اب ہے جنوب اور ماتی اب ہے شمال      رخت باندھے ہیں خوشی و شادی و عیش و طروب  
قامعِ بدعت وہ تھے اور دافعِ رنج و فساد      قاطعِ پنجِ جدال اور فیصلہ بخشِ حروب  
عیسوی سن کو کہا ہاتف نے ہوا فردہ دل      ”ہو گیا ہے آفتابِ علم کا آہ اب غروب“

(انیس سو انیس) ۱۹ ھ ۱۹

ایک فارسی قطعہ تاریخ کا یہ شعر طبع موزوں کا شاہد عدل اور پوری صداقت پر مبنی ہے:

بہ تبدیلِ حرفِ زِ مصحفِ بخواں      ”فقد فاز فوزا عظیما“ سنش

(تیرہ سوئیتیس) ۳۷ ھ ۱۳

(”رحلت شیخ ویلور“ مطبوعہ ۱۹۱۹ء در شاہ الحمیدیہ پریس، مدراس)

حضرت علمی نے فخر الواعظین، سرآمد شعرائے ماہرین، سرکردہ فقہاء و محدثین، استاذ الاساتذہ

علامہ حافظ قاری الحاج عبدالقادر بادشاہ فخر و یلوری کی وفات حسرت آیات پر ایک مرثیہ بزبان فارسی کہا تھا، جس میں مرقوم لاجواب قطعہ تاریخ فنی و فکری علوشان کا بین ثبوت ہے:

مخلص من! داستانِ چرخ بیدادی مگوے بادۂ عشرتِ مخواه و جادۂ شادی میوے  
زانکہ شاہِ ماگذشت از من شنو سالِ وفات راہی فردوس شد آں پادشاہِ نیک جوے  
اپنے استاذ زادے محترم محمد امین ابن حضرت مفتی اعظم شیخ آدم (ناظر مدرسہ باقیات  
صالحات) کی تقریب شادی خانہ آبادی منعقدہ بتاریخ ۱۷ محرم الحرام ۱۳۶۵ھ کے موقع پر ایک  
تہنیتی نظم بزبان عربی پڑھی تھی، جس میں سن عقد کا استخراج بڑی ہنرمندی سے کیا ہے، ملاحظہ ہو:  
”هَذَا الْعَقْدُ مُجْتَبَى تَارِيخُهُ فِي سِرِّ قَلْبِي إِنَّهُ الْإِلْقَاءُ  
(تیرہ سو پینسٹھ) ۱۳۶۵ھ

خُذْ هَذِهِ الْأَشْعَارَ جَهْدًا إِذَا حَلَّتْ قَدْ قَالَهَا الْعِلْمِيُّ وَهِيَ لِفَاءُ  
(”ورد التبریک“ مطبوعہ ۱۳۶۵ھ مطبع اختر پریس، بنگلور)

حضرت علامہ امانی باقوی: شیخ الملتہ ضیاء الادب علامہ ضیاء الدین احمد امانی (ولادت  
۱۳۱۱ھ وفات ۱۳۸۶ھ) اعلیٰ حضرت بانی باقیات علیہ الرحمہ کے تلامذہ میں اس لئے ممتاز و مشہور  
ہیں کہ انہوں نے نہ صرف عربی، فارسی اور اردو زبان کے ماہر کی حیثیت سے علمی دنیا میں اپنا لوہا  
منوایا بلکہ تمل زبان و ادب اور اس کے قواعد نحو و صرف پر بھی گرانقدر تحقیقی خدمات انجام دے کر  
اہل علم سے خراج تحسین حاصل کیا، مدرسہ باقیات صالحات سے فراغت (۱۳۳۵ھ مطابق ۱۹۱۷ء)  
کے بعد اعلیٰ حضرت نے مادر علمی ہی میں خدمت درس و تدریس کی ذمہ داری سونپی اور شرف بیعت  
سے مشرف کیا، اعلیٰ حضرت کا وصال (۱۳۳۷ھ) مریدوں، معتقدوں اور شاگردوں کے لیے ایک  
جانکاہ حادثہ سے کم نہ تھا، حضرت امانی نے اپنے شدید احساسات کی ترجمانی کرتے ہوئے فرمایا:

حسرتا! آج ہے اک مردِ خدا کا ماتم خضرِ راہ و سراجِ العرفا کا ماتم  
مرشد و قبلہ گہہ و شمعِ ہدیٰ کا ماتم عبد وہاب کا شمس العلماء کا ماتم  
ہائے! پھر ہم کو ملے آپ سا استاذ کہاں کون بتلائے ہمیں رمزِ حدیث و قرآن  
وادرِ یغا، کہ کہیں کس سے ہم اب درد نہاں اللہ اللہ کہ نہیں ہم کو ہے تابِ ہجراں



(”رحلت شیخ ویلور“، ص: ۳۰-۳۱ مطبوعہ ۱۹۱۹ء مطبع محمدیہ، مدراس)

شیخ ویلور کے بعد حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ سے رجوع کیا اور پھر حضرت کے انتقال کے بعد انہیں کے خلیفہ مولانا محمد سعید کیرنوری (تمل ناڈو) کے ہاتھوں خرقہ خلافت سے نوازے گئے۔ ام المدارس مدرسہ باقیات میں ربع صدی تک تدریسی خدمات انجام دیں بعد ازاں وہ جامع منبع الانوار لال پیٹ، تمل ناڈو (قائم شدہ: ۱۳۸۱ھ) منتقل ہو گئے اور پھر وہیں علمی مصروفیات میں دم آخریں تک رہ کر واصل بہ حق ہوئے۔

علامہ امانی کا علمی قد فلک بوس ہے، علوم معقول و منقول کے علاوہ علم فلکیات پر کامل عبور حاصل تھا، معرفت قبلہ اور ہیئت و ہندسہ میں بالترتیب ”عمدة الادلة فی مواقیت الصلوة وسموت القبلة“ اور ”الکرة المیشرة“ جیسی گرانقدر کتابیں تصنیف کیں، نظم و نثر پر یکساں قدرت حاصل تھی، بیس سے زائد کتابیں تحریر کیں، جن میں ”گلشن سیرت“ (سیرت منظوم اردو حصہ اول و دوم، مطبوعہ ۱۳۶۷ھ اور ۱۳۶۹ھ) انتخاب دیوان امانی فارسی (مطبوعہ ۱۳۳۷ھ) مرثیہ اعلیٰ حضرت، عربی (مطبوعہ ۱۳۳۷ھ) اور ”زجر الامم“ (مطبوعہ ۱۳۸۱ھ مطابق ۱۹۶۲ء) مشہور و مقبول ہیں۔

علامہ امانی بلند پایہ شاعر و نقاد ہونے کے ساتھ ماہر غالبیات بھی تھے، علامہ سید علی حیدر نظم طباطبائی (۱۹۳۳ء-۱۸۵۲ء) کے مرزا غالب پر کیے گئے اعتراضات کا مدلل و مسکت جواب دیا جس کو ہندوستان بھر کے اہل علم نے بے حد پسند کیا۔ حتیٰ کہ جب اپنے قیام حیدرآباد کے موقع پر علامہ نظم طباطبائی سے ملاقات کر کے مختلف ادبی موضوعات پر خصوصاً شرح غالب کے مندرجات پر گفتگو کی تو علامہ نظم کی فراست و قوت حافظہ اور گفتگو کے سلیقہ سے کافی متاثر ہوئے اور فرمایا کہ ”آپ کی نظر بہت بلیغ ہے“۔ (ماخوذ از ماہنامہ ”معیار ادب“، بنگلور مدیر مجوی صدیقی لکھنوی، شمارہ مارچ ۱۹۸۲ء، ص: ۳۵) مضمون ”غالب و طباطبائی“ از علامہ امانی باقوی)

علمی و ادبی مضامین اس وقت کے موقر معیاری جرائد مثلاً نیرنگ خیال، ادبی دنیا، جلوہ یار، جلوہ سخن، ریاض الاخبار، مصحف، الناظر وغیرہ میں شائع ہوتے رہتے تھے جس سے ہند کے طول و عرض میں بحیثیت نقاد متعارف و مشہور ہو گئے۔ شاعری کے علاوہ فن تاریخ گوئی میں بھی ملکہ حاصل تھا۔ مختلف احوال و آثار پر تاریخیں کہی ہیں، یہاں ”مشتے نمونہ از خروارے“ کے مصداق چند

مثالوں کا ذکر کیا جا رہا ہے تاکہ اس فن لطیف پر ان کی خلاقانہ گرفت کا علم ہو سکے۔  
اپنے استاذ و مرشد کی وفات پر چھہتر (۷۶) اشعار پر مشتمل ایک مرثیہ عربی میں لکھا تھا جس کے سرورق پر آیت کریمہ ”والملائکۃ یدخلون علیہم من کل باب الخ سے مستنبط جملہ ”یدخل الملائک علیہ من کل باب سلام علیکم“ سے سال رحلت ۱۳۳۷ھ برآمد کیا ہے۔ اس طرح قرآنی آیت ”ان الممتقین فی جنات و عیون“ تصور میں رکھتے ہوئے ”ان للممتقین لجنات و عیون“ کے با معنی جملے سے سن وفات (تیرہ سو سینتیس) ۱۳۳۷ھ کا استخراج کیا ہے۔ (مرثیہ مرشدنا و مولانا الحاج شاہ عبدالوہاب ویلوری، مطبع کربئی، مدراس)

اپنے یار غار اور مخلص ترین دوست حضرت علامہ عبدالصمد عظمیٰ کی رحلت پر قطعہ ہائے تاریخ عربی اور اردو دونوں زبانوں میں اس خوبی کے ساتھ کہے ہیں جس سے سال رحلت کے علاوہ مرحوم و مغفور کے علمی و ادبی کمالات مترشح ہوتے ہیں:

حسرتا ، پھر کہاں وہ گرمی بزم مئے سے خالی ہوا ایغ علم  
اب ہیں گم کردہ راہ، طالب فن پائیں گے کس طرح سراغ علم  
فی البدیہی کہا امائی نے سال رحلت ”بجھا چراغ علم“  
(تیرہ سو پینسٹھ) ۶۵ ھ ۱۳

عربی نظم کا آخری شعر اس طرح کہا ہے:

لَمَّا تَوَفَّتْكَ الْمَلَائِكُ بَغْتَةً أَرَخْتُ حَرْفًا مَمَاتٍ شَيْخُ أَجْوَدٍ  
(تیرہ سو پینسٹھ) ۶۵ ھ ۱۳

(ماخوذ از: ”الکرب العظیم“ مطبوعہ ۱۳۶۵ھ در مطبع آفتاب، مدراس)

ایک اور مرثیہ حضرت مکان قطب ویلور کے سجادہ نشین اعلیٰ حضرت ابوالفتح سلطان محی الدین سید شاہ عبدالقادر قادری کی وفات حسرت آیات پر حضرت امائی نے فارسی میں رقم کیا تھا جس کے منتخب شعر یہ ہیں، اس قطعہ منظوم کے آخری شعر کی معنوی لطافت قابل دید وائق تحسین ہے:

یاد احمد تازہ بود از رویت سبط رسول صادق است ای قول بونے گل بجویم از گلاب

درندائے پاک رضواں ہیں امائی سال وصل برلش ”یا اہل غفران“ بود و کردہ فتح باب  
(تیرہ سواٹھتر) ۱۳۷۸ھ

وہ جس وقت قصبہ لال پیٹ کے مدرسہ ”منبع الانوار“ تشریف لائے تو ان کے قلم معجز  
رقم سے ایک بہترین قطعہ تاریخ نکلا جس سے مدرسہ کی تاسیس کا سال واضح ہو جاتا ہے:

بَنَى رَبِّي لِعِلْمِ الدِّينِ قَصْرًا وَكُلُّ الطَّالِبِينَ لَهُ اسْتَحَقَّ  
فَقَالَ النَّاسُ حِينَ الْفَتْحِ ارْحَا “ذُكَاءَ مَنْبَعِ الْأَنْوَارِ حَقًّا”  
(بارہ سواکیاسی) ۱۲۸۱ھ

ہندوستان کی مشہور و معروف دینی درسگاہ دارالعلوم سبیل الرشاد، بنگلور جو آج یونیورسٹی کی  
حیثیت اختیار کر چکی ہے، اس کے بانی و مہتمم امیر شریعت (اول) حضرت علامہ حافظ قاری ابوالسعود  
احمد باقوی (متوفی ۱۳۱۷ھ) کا شمار اہل دل میں ہوتا ہے، وہ علامہ امائی کے داماد ہیں۔ جب  
سبیل الرشاد کے قیام کی تاریخ کے لیے اپنے خسر محترم سے درخواست کی، تو علامہ امائی نے  
برجستہ خوبصورت اور بامعنی عربی قطعہ کہا جو حسب ذیل ہے:

بَنَى لِنَشْرِ الْعُلُومِ قَصْرًا إِلَهْنَا مُرْشِدُ الْعِبَادِ  
فَحِينَ مَا زُتْ أَرَحْتُ “ذَا سَبِيلِ إِلَى الرَّشَادِ”  
(تیرہ سواٹسی) ۱۳۸۰ھ

(باقی)

## تذکرۃ المحدثین (حصہ اول تا سوم)

مولانا ضیاء الدین اصلاحی

قیمت: ۲۰۰ روپے

حصہ اول: (جدید ایڈیشن)

قیمت: ۲۲۵ روپے

حصہ دوم: (جدید ایڈیشن)

قیمت: ۱۲۵ روپے

حصہ سوم: ہندوستان کے صاحب تصنیف محدثین کے حالات پر

## قیام امن سے متعلق عیسائیت کی تعلیمات اسلام کے تناظر میں ڈاکٹر توقیر عالم فلاحی

مذاہب عالم میں عیسائیت یا مسیحیت وہ مذہب ہے جو امن و عدل، انسانیت نوازی اور بشر دوستی کا دعوے دار ہے لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ظلم و عدوان کے استیصال میں اور امن و آشتی کی خوشگوار اور مبارک صورت حال کے فروغ میں عیسائیت کی تعلیمات کس حد تک مثبت اور شایان انسانیت رول ادا کرتی ہیں۔ اس مقالے میں قیام امن و عدل سے متعلق اسلامی تعلیمات کے تناظر میں عیسائیت کی ان تعلیمات کا جائزہ لینے کی کوشش کی گئی ہے جو بشر دوستی اور انسانیت نوازی پر مبنی معلوم ہوتی ہیں اور جنہیں مسیحیت کے افکار و عقائد اور تعلیمات و ہدایات میں شاہکار کی حیثیت حاصل ہے۔

مخلوقات ارضی و سماوی میں انسان کو اشرف المخلوقات ہونے کی سعادت حاصل ہے (۱)۔ کائنات کی ساری چیزیں معزز ترین مخلوق انسان کی خدمت پر مامور ہیں اور بایں طور وہ اپنے مقصد تخلیق کو پورا کر رہی ہیں۔ انسان جو مخدوم کائنات ہے اس کے شرف و سعادت کا راز اس صداقت میں پنہاں ہے کہ وہ ہر معاملہ زندگی میں اور ہر گوشہ عالم میں خالق کائنات اور معبود حقیقی کی مرضی و منشاء کے حصول میں سرگرم عمل رہے۔ اللہ رب العزت سے محبت اور اللہ کے بندوں سے محبت یعنی حقوق اللہ اور حقوق العباد یہی دو امور دین و شریعت کی اصل ہیں جن کی انجام دہی کے بعد ہی وہ انسانیت کی معراج حاصل کر سکتا ہے۔ ان دونوں حقوق کی ادائیگی سے متعلق مذہب عیسائیت کی تعلیمات ملاحظہ کی جائیں۔ متی کی انجیل میں دین و شریعت کے عظیم ترین

ریڈر، شعبہ دینیات (سنی)، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔

احکام کی حیثیت سے یہ زریں تعلیمات مرقوم ہیں:

”اور جب فریسیوں نے سنا کہ اس نے صدوقیوں کا منہ بند کر دیا تو وہ جمع ہو گئے اور ان میں سے ایک عالم شرع نے آزمانے کے لیے اس سے پوچھا کہ اے استاد تو ریت میں کون سا حکم بڑا ہے۔ اس نے اس سے کہا کہ خداوند اپنے خدا سے اپنے سارے دل اور اپنی ساری جان اور اپنی ساری عقل سے محبت رکھ بڑا اور پہلا حکم بھی ہے اور دوسرا اس کی مانند یہ ہے کہ اپنے پڑوسی سے اپنے برابر محبت رکھ۔ ان ہی دو حکموں پر تمام توریت اور انبیاء کے صحیفوں کا مدار ہے۔“ (۲)

انجیل کی مذکورہ بالا تعلیمات سے یہ امر تشنہ توضیح نہیں رہتا کہ انسان کی تخلیق اس دنیا میں محبت کے لیے ہوئی ہے۔ یہ محبت اولاً کائنات کے پیدا کرنے والے سے ہوگی اور ثانیاً اللہ کے بندوں سے ہوگی بلکہ خدا سے محبت کا معیار یہ ہے کہ اس کے بندوں سے محبت کی جائے۔ انجیل کی مذکورہ بالا آیتوں میں جو روح کا فرما ہے اس کی وضاحت ایک عیسائی عالم کے ان فقرات سے ہوتی ہے:

”لیکن خدا سے محبت کی مضبوط و مستحکم تعبیر انسانوں سے محبت میں پائی جاتی ہے۔ کوئی ایسا شخص خدا سے محبت نہیں کر سکتا جو بنی نوع انسان سے محبت نہیں کرتا۔ چنانچہ عیسائی مذہبی عقیدے میں انسانوں کی خدمت ایک مستقل جاری عمل ہے..... دنیا میں بڑے پیمانے پر سماجی عدل و انصاف کو فروغ دینے کے لیے تمام تر کوششیں، ایک نئی انسانیت کی تشکیل و تعمیر کے لیے تمام مصروفیات، انفرادی و اجتماعی مظالم سے نجات یابی کی تمام تر جدوجہد اور انسانی مصروفیات و مشغولیات کی ہر شکل مذہبی قدر و منزلت کی حامل ہے، اگر اس قانون محبت کے ذریعے اسے تحریک ملتی ہے۔“ (۳)

حضرت عیسیٰ مسیح کے نزدیک شریعت کا سب سے بڑا حکم خدا سے محبت رکھنے کے بعد اپنے پڑوسی سے محبت رکھنا ہے۔ لیکن وہ صرف محبت کرنے اور غصہ و نفرت نہ کرنے پر ہی اکتفا نہیں کرتے بلکہ تلقین فرماتے ہیں کہ ایک سچے عیسائی کا یہ شیوہ و شعار ہونا چاہیے کہ ظلم و عدوان اور

بغاوت و سرکشی کے آگے وہ سپر انداز ہو جائے بلکہ شریکینوں اور فتنہ پرووں کے سامنے اپنے حق سے بھی دست بردار ہو جائے۔ پہاڑی کا وعظ ان کی تعلیم کا گل سرسبد ہے جس پر مسیحی اخلاق و کردار کی بنیاد رکھی ہوئی ہے۔ حضرت عیسیٰؑ اس وعظ میں فرماتے ہیں:

”تم سن چکے ہو کہ کہا گیا تھا کہ آنکھ کے بدلے آنکھ اور دانت کے بدلے دانت لیکن میں تم سے کہتا ہوں کہ تم شریر کا مقابلہ نہ کرو، بلکہ جو کوئی تیرے داہنے گال پر طمانچہ مارے تو دوسرا بھی اس کی طرف پھیر دے اور کوئی تجھے پرناش کر کے تیرا کرتا لینا چاہیے تو چوغہ بھی اسے لینے دے اور جو کوئی تجھے ایک کوس ریگڑ میں لے جائے تو اس کے ساتھ دو کوس چلا جا..... تم سن چکے ہو کہ کہا گیا تھا کہ اپنے پڑوسی سے محبت رکھو، جو تم پر لعنت کریں، ان کے لیے برکت چاہو، جو تم سے نفرت کریں، ان سے اچھا سلوک کرو، جو تمہیں ذلیل کریں اور تمہیں ستائیں، ان کے لیے دعا مانگو۔“

حضرت عیسیٰؑ اسی وعظ میں فرماتے ہیں:

”میں تم سننے والوں سے کہتا ہوں کہ اپنے دشمن سے محبت رکھو، جو تم سے عداوت رکھیں ان کا بھلا کرو، جو تم پر لعنت کریں ان کے لیے برکت چاہو، جو تمہاری بے عزتی کریں ان کے لیے دعا مانگو، جو تیرے ایک گال پر طمانچہ مارے تو اس کے سامنے دوسرا بھی پھیر دے، جو تیرا چوغہ لے اس کو گرتے لینے سے بھی منع نہ کر جیسا تم اوروں سے برتاؤ چاہتے ہو تم بھی ان کے ساتھ ویسا ہی کرو۔ اگر تم محبت رکھنے والوں ہی سے محبت رکھو تو تمہارا کیا احسان ہے؟ کیونکہ گناہ گار بھی اپنے محبت رکھنے والوں سے محبت رکھتے ہیں۔“ (۴)

حقوق اللہ اور حقوق العباد کے تعلق سے حضرت عیسیٰؑ مسیح کی تعلیمات اور پہاڑی کے وعظ کے یہ کلمات حسنہ کس حد تک خوشگوار اور دور رس اثرات و نتائج کے حامل ہیں۔ اگر دقت نظری سے جائزہ لیا جائے تو یہ کوئی لاینحل مسئلہ نہیں رہ جاتا، بلاشبہ اسلام میں بھی حقوق اللہ اور حقوق العباد کا نظریہ بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ نماز، روزہ، حج، قربانی اور تلاوت کلام پاک وغیرہ ایسے امور ہیں

جن کا تعلق خالصتاً اللہ کی ذات سے ہے۔ یعنی یہ اگر انجام دیے جا رہے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ اللہ کے حقوق کی ادائیگی ہو رہی ہے۔ یہ ممکن ہے کہ شرک کے علاوہ ایک شخص کی جانب سے حقوق اللہ کی ادائیگی میں دانستہ یا نادانستہ تقصیرات و خطایا پر اللہ رب العزت اپنی شان رحیمی کا مظاہرہ کرتے ہوئے خط غفوپھیر دے لیکن حقوق العباد تلف کرنے کے نتیجے میں نہ صرف یہ کہ اس کی طرف سے معافی کا پروانہ نہیں ملے گا بلکہ آخرت میں جب میزان عدل قائم ہوگی تو وہ بڑا مفلوک الحال اور قلاش ثابت ہوگا۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بابت بڑا واضح فرمان دیا ہے:

ان المفلس من امتی یا تی یوم  
القیامۃ بصلوۃ و صیام و زکوۃ و  
یا تی قد شتم هذا وقد و هذا  
واکل مال هذا و سفک دم هذا  
و ضرب هذا فیعطی هذا من حسناته  
وهذا من حسناته فان فیت حسناته  
قبل ان یقضی ما علیہ اخذ من  
خطایا هم فطرح علیہ ثم طرح  
فی النار۔ (۵)

بلاشبہ میری امت کا مفلس وہ شخص ہے جو قیامت  
کے روز نماز، روزہ، زکوۃ اور حج کر کے ہوا ہو کہ اس  
نے کسی پر سب و شتم کیا ہو، کسی پر بہتام تراشی کی تھی  
، کسی کا مال کھایا تھا اور کسی کو زد و کوب کیا تھا۔ پس  
ایسے (مظلوم) شخص کو اس (ظالم) کی نیکیوں میں  
سے بدلہ دیا جائے گا۔ پس اگر ظالم کی نیکیاں  
مظلومین کو بدلہ چکانے سے پہلے ختم ہو گئیں تو ان  
(مظلومین) کے گناہوں کا بار (مظالم کے بقدر)  
ان کے کاندھوں پر ڈال دیا جائے گا پھر اسے جہنم

میں پھینک دیا جائے گا۔

اسلام کے نزدیک مخلوقات اللہ کے خاندان کے لوگ ہیں وہ اس بات پر زور دیتا ہے کہ انسان چاہے جس خطہ ارض کا رہنے والا ہو اور جس رنگ و نسل سے اس کا تعلق ہو، وہ ایک ہی ماں باپ کی اولاد ہیں (۶)۔ اس لیے آپس میں اخوت و محبت اور ہمدردی و غم گساری کے جذبات کو فروغ و استحکام بخشا جائے۔ اللہ کے تمام بندوں کے ساتھ حسن سلوک کی تلقین کی جاتی ہے بالخصوص مجبور و پریشان حال بندگان خدا سے اظہار محبت و ہمدردی اور حسن سلوک کو اللہ رب العزت کے ساتھ حسن سلوک قرار دیا جاتا ہے۔ حدیث پاک ملاحظہ فرمائیں:

”بلاشبہ قیامت کے روز اللہ تبارک و تعالیٰ (ایک بندے سے) فرمائے گا کہ آدم



کے بیٹے! میں بیمار تھا اور تو نے میری عیادت نہیں کی تھی، تو بندہ تعجب سے کہے گا کہ اے میرے آقا! میں تیری عیادت کیسے کرتا حالانکہ تو دونوں جہاں کا رب ہے۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ کیا تمہیں معلوم کہ میرا فلاں بندہ بیمار تھا اور تو نے اس کی عیادت نہیں کی۔ اگر تو اس کی عیادت کرتا تو تو مجھے اس کے قریب پاتا۔ اسی طرح ایک بندے سے فرمائے گا کہ آدم کے بیٹے! میں نے تم سے کھانا مانگا تھا لیکن تو نے مجھے کھانا نہیں کھلایا۔ بندہ حیرت سے عرض کرے گا کہ اے میرے آقا! آپ تو ساری دنیا کے پالنے والے ہیں، آپ کو میں کیسے کھانا کھلاتا۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ کیا تمہیں معلوم کہ میرے فلاں بندے نے تجھ سے کھانا مانگا تھا لیکن تو نے اسے کھانا نہیں دیا۔ کیا تمہیں معلوم نہیں تھا کہ اگر تو نے اسے کھانا کھلایا ہوتا تو تو نے مجھے اس کے پاس پایا ہوتا۔ اسی طرح وہ ایک بندے سے فرمائے گا کہ میں پیاسا تھا لیکن تو نے مجھے پانی نہیں پلایا تھا تو بندہ (حیرت و استعجاب سے) کہے گا کہ اے میرے آقا! آپ تو پوری دنیا کو سیراب کرنے والے ہیں، آپ کو میں کیسے پانی پلاتا۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ میرے فلاں بندے نے تجھ سے پانی مانگا تھا لیکن تو نے اسے پانی نہیں پلایا۔ اگر تو نے اسے پانی پلایا ہوتا تو مجھے اس کے پاس پایا ہوتا۔“ (۷)

حقوق اللہ اور حقوق العباد سے متعلق انتہائی واضح اور درخشاں تعلیمات اسلام میں موجود ہیں۔ عاجزی و خاکساری، تذلل و فروتنی، صبر و قناعت، عفو و درگزر، حلم و بردباری، یقیناً یہ اخلاق حسنہ ہیں جن کی فضیلت مسلمہ حقیقت ہے لیکن جب دنیا میں خیر کے ساتھ شر موجود ہے، نیکی کے ساتھ بدی بھی پائی جاتی ہے اور عدل و انصاف کے ساتھ ظلم و جور اور امن و آشتی کے ساتھ فتنہ انگیزی و فتنہ پروری بھی معاشرے کا جزو لا ینفک قرار پاتی ہے، ایسی صورت میں نیکی کو یکہ و تنہا چھوڑ دینا اور اللہ کی دی ہوئی قوتوں اور اسباب و وسائل کو اس کی بقا و حفاظت کے لیے استعمال نہ کرنا یہ بالواسطہ بدی کی طاقت کو پروان چڑھانے اور فتنہ و شر کی امداد ہے۔ ایک گال پر طمانچہ کھانے کے بعد دوسرا گال اس کے لیے پیش کر دیا جانا بظاہر خیر و صلاح اور برّ و تقویٰ کا مظہر ہے لیکن سچ تو یہ ہے کہ عمداً ظالموں کو موقع دیا جائے اور مفسدوں کو ان کے حال پر چھوڑ دیا جائے، یہ

پرلے درجے کی بزدلی ہے جس کی بنیاد پر دنیا امن و آشتی کا گہوارہ بننے کے بجائے شروفساد اور بدامنی و تشدد کی آماج گاہ بن جاتی ہے۔ انسانیت کی خیر و فلاح کی خاطر خدا کی زمین پر امن و آشتی کا قیام و استحکام ہی دراصل انسانیت کی عظیم الشان خدمت اور اس سے محبت کا اعلیٰ مظہر ہے۔ اس باب میں قرآن مجید تمام فرزند ان اسلام کو دنیا کا جیدہ گروہ قرار دیتے ہوئے فلاح انسانیت پر اپنی توجہات مرکوز کرنے کی تلقین کرتا ہے اور یہ ذہن نشیں کراتا ہے کہ انسانیت کی خدمت کے اس عظیم اور مقدس مقصد کی یافت معروفات کی تبلیغ و تلقین اور منکرات کی بیخ کنی کے ذریعہ ہی ممکن ہے۔ آیت کریمہ ملاحظہ فرمائیں:

كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ      تم لوگ ایک بہترین امت ہو جسے انسانیت کے  
تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ      لیے میدان میں لایا گیا ہے۔ تم نیکی کا حکم دیتے  
الْمُنْكَرِ - (۸)

خیرات و حسنات کو منکرات و سیئات کا قلع قمع کر کے انسانیت کو امن و راحت کی نعمت سے ہمکنار کرنا بلاشبہ بڑا ہی مبارک و مستحسن فریضہ ہے۔ اگر معاشرے کی برائیاں غفودر گذر، صبر و تحمل اور تذلل و فروتنی سے معدوم ہو جاتی ہوں تو بلاشبہ یہ دلنشین اور موثر حربہ ہیں۔ اسلام میں برائی کو اچھائی سے بدلنے کا یہ اقدام ایک بڑی پر حکمت تدبیر (Strategy) قرار دی جاتی ہے جسے اختیار کرنے کی تلقین کی جاتی ہے۔

وَلَا تَسْتَوِی الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ ادْفَعْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ فَإِذَا الَّذِي بَيْنَكَ وَبَيْنَهُ عَدَاوَةٌ كَأَنَّهُ وَلِيٌّ حَمِيمٌ - (۹)

اس کے برعکس اگر بدی پر ان اخلاق فاضلہ کے ذریعہ قابو نہیں پایا جاتا تو عیسائیت کی طرح عزت نشیں اور کنارہ کش ہونے کی تعلیم اسلام میں نہیں دی جاتی بلکہ یہ میدان کارزار میں سرگرم عمل ہونے کی تلقین کرتا ہے اور اس کے انسداد کی کوششوں کو تقاضہ ایمان قرار دیتا ہے۔ اللہ رب العزت کا ارشاد ہے:

وَالَّذِينَ إِذَا أَصَابَهُمُ الْبَغْيُ هُمْ      اور جب ان پر زیادتی کی جاتی ہے تو ان کا مقابلہ  
يَنْتَصِرُونَ - (۱۰)

کرتے ہیں۔

رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان بھی کذب و بطلان اور شر و فساد کے خلاف اقدامی عمل کی دعوت دیتا ہے:

من رای منکم منکرا فلیغیر بیدہ  
فان لم یستطع فبلسانہ فان لم  
یستطع فبقلبہ وذلک اضعف  
الایمان۔ (۱۱)

تم میں سے کوئی بھی کسی برائی کو دیکھے تو اس کا فرض  
ہے کہ اسے طاقت کے زور سے مٹا دے، اگر وہ  
اس کی استطاعت نہیں رکھتا ہے تو اسے اپنی زبان  
سے مٹا دے۔ وہ اگر اسے زبان سے بھی روکنے  
کی استطاعت نہیں رکھتا ہے تو اسے اپنے دل سے  
مٹا دے اور یہ ایمان کا کمزور ترین درجہ ہے۔

حدیث مذکور میں ایمان کے تین مراتب بیان کیے گئے ہیں۔ ایمان ہر حال میں بدی کے خلاف حرکت کا نام ہے۔ اگر عفو و درگزر اور حلم و بردباری کے ذریعہ شر انگیزی و فتنہ پروری پر قابو نہیں پایا جا رہا ہو تو اسے روکنے کے لیے حتی المقدور وسائل کا استعمال دراصل محبت انسانیت اور تقاضہ ایمان ہے۔ ایمان کا کمزور ترین درجہ دل سے روکنے کا ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ برائی اور برائی کے ارتکاب کرنے کے سلسلے میں کوئی نرم گوشہ نہیں ہونا چاہیے بلکہ غم و غصہ اور نفرت کا مظاہرہ ہونا چاہیے۔ یہاں تک کہ اضطراب و بے چینی کا یہ عالم ہو کہ معمولات و مصروفیات میں بھی اس کے اثرات نمایاں ہوں۔ یہاں اگر محبت کی قوتیں استیصال شر میں کارگر نہ ہو سکیں تو ان اسباب و وسائل کو بروئے کار لانا چاہیے جو اس سلسلے میں کامیابی سے ہمکنار کر دیں۔ برائیوں کو دیکھ کر اضطراب و بے چینی اور اچھائیوں کو دیکھ کر راحت و سرور سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے بقول ایمان کے مظاہر ہیں۔ اسی کو احادیث نبویہ میں اللہ کی خاطر دوستی اور اللہ کی خاطر دشمنی سے بھی تعبیر کیا گیا ہے اور یہ ایسا مبارک عمل ہے جو قیامت کے روز ظل الہی کی سعادت سے شرفیاب ہونے کا ضامن قرار پاتا ہے (۱۲)۔ یہ نکتہ قابل لحاظ ہے کہ اسلام اس مرحلے میں بھی جب کہ ظالم سے نبرد آزمائی کی تلقین کرتا ہے، اس کی خیر خواہی کا علم بھی اپنے ہاتھوں میں اٹھاتا ہے۔ اسلام دراصل فتنہ پرور، ظالم اور باغی سے نہیں بلکہ وہ فتنہ پروری، ظلم، بدی اور بغاوت سے نفرت کرتا ہے اور اگر وہ برائی کے خلاف آواز بلند کرتا ہے اور اس کے انسداد کے لیے عملی اقدامات کی تعلیم و

تلقین کرتا ہے تو اس میں بھی پورے معاشرے کی خیر و فلاح کے علاوہ اس ظالم و فتنہ پرور کے حق میں ہمدردی و محبت اور کامیابی و کامرانی کا فلسفہ مضمر ہوتا ہے۔ اس لیے کہ بدی کا مرتکب اور ظلم و عدوان کا علم بردار اگر اپنے اعمال شنیعہ اور حرکات ذمیمہ سے معاشرہ انسانی کے امن و آشتی کو درہم برہم کرتا ہے، وہیں وہ اپنے قلب و ضمیر کے امن و آشتی کو بھی داؤ پر لگا دیتا ہے اور آخرت کے بازار میں اس کی یہ حرکتیں کھوٹا سکتے بلکہ افلاس و محرومی کا پیش خیمہ بن جاتی ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان میں یہی فکر و فلسفہ ناطق ہے۔ ملاحظہ فرمائیے:

انصر اخاک ظالما او مظلوما ، یا  
رسول اللہ هذا ننصرہ مظلوما  
فکیف ننصرہ ظالما قال تاخذ  
سبحہ میں آتی ہے) لیکن ہم ظالم کی مدد کیسے کریں۔  
آپؐ نے فرمایا اس کے ظلم کے ہاتھوں کو مروڑ دو۔  
فوق یدیدہ۔ (۱۳)

مسیحیت کا نظریہ یہ ہے کہ دین کا اصل الاصول محبت ہے اس کے علاوہ تمام انسانی خصائل اور فطری جذبات باطل اور باطل ہیں جن کی بیخ کنی کے ذریعہ دین داری یا راست بازی کی افزائش ہو سکتی ہے۔ اس نظریہ کے علم برداروں کی نگاہ اس حقیقت کے ادراک سے دور ہیں کہ کائنات کی کوئی چیز عبت نہیں ہے (۱۴)۔ حالانکہ غضب، غصہ، حب نفس، شہوت، شجاعت و خودداری، جرأت و بہادری، عزم و استقلال، عدل و انصاف یہ سب چیزیں انسانیت کے لوازم و مقتضیات ہیں۔ یہ سب عواطف و جذبات اپنے اپنے موقع و محل میں شایان انسانیت فرائض انجام دیتے ہیں اور یہ سب اوصاف ایک نظم و ضبط کے پابند ہو کر اعتدال اور میانہ روی کی روح سے متصف ہوں تو حتمی طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ اوصاف موقع و مناسبت کے لحاظ سے ایک نمونے کے انسانی معاشرہ کے قیام و استحکام کے نئے عوامل و اسباب کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس کے برعکس یہ انسانی جذبات اور اخلاقی خصائص اگر بے لگام ہو کر افراط و تفریط کا شکار ہو جائیں تو یہ سب کسی سماج کے لیے ناسور بن جاتے ہیں۔ بیسویں صدی کے ایک مایہ ناز دانشور اور مفسر قرآن کی عیسائیت کے پس منظر میں یہ وضاحت معنی خیز ہے:

”شجاعت اگر حد سے بڑھ جائے تو تھوڑا اور حماقت کے درجہ تک پہنچ

جاتی ہے۔ دورانِ اندیشی اگر افراط کا پہلو اختیار کر لے تو بزدلی اور نامردی بن جاتی ہے۔ رحم اگر اپنی قدرتی حدود میں نہ رہے تو جرائم و معاصی کا مددگار بن جاتا ہے۔ فیاضی اگر حد سے گزر جائے تو اسراف و تبذیر کی صورت اختیار کر لیتی ہے، کفایت شعاری اگر زیادہ ہو جائے تو بخل اور کنجوسی سے بدل جاتی ہے، محبت اگر اپنی حدود میں نہ رہے تو انسان کی عقل کو اندھا کر دیتی ہے، مروت اگر بے موقع استعمال کی جائے تو بدکاریوں میں جسارت اور بے باکی پیدا کر دیتی ہے۔ حلم و بردباری اگر بے محل ہو تو گستاخی اور ظلم کی محرک بن جاتی ہے، فروتنی اور انکساری اگر بے جا ہو تو خودداری اور عزت نفس خاک میں مل جاتی ہے۔ غرض یہ کہ نفس انسانی کو جتنی قوتیں عطا کی گئی ہیں سب اپنے اچھے اور برے دونوں پہلو رکھتی ہیں..... جس طرح ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ انسان کے لیے صرف ہاتھ پاؤں اور قلب و دماغ ہی مفید ہیں، آنکھ، ناک، معدہ و جگر وغیرہ کی ضرورت نہیں ہے، قوت سامعہ اور لامسہ کافی ہے، باصرہ اور شامہ کی ضرورت نہیں ہے، محض شعور و ادراک کفایت کرتا ہے، حافظہ اور تمیز کی ضرورت نہیں ہے، بالکل اسی طرح ہم یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ انسان میں صرف محبت و رحم، عفو و درگزر، عجز و فروتنی ہی کی ضرورت ہے، نفرت و غضب، شجاعت و مردانگی، خودداری و عزت نفس اور غیرت و حمیت وغیرہ کی ضرورت نہیں ہے۔ (۱۵)

یہ دنیا دار العمل یا دار الامتحان ہے۔ یہاں کی ساری چیزیں اصل امتحان دہندہ انسان کے لیے امتحان کی تیاری کے لوازم و مقتضیات اور اسباب و عوامل کی حیثیت رکھتی ہیں۔ دنیوی اسباب و وسائل سے احتراز و اجتناب خود اپنے اوپر ظلم ہے۔ اس لیے کہ اس طریقہ عمل سے ایک شخص اپنے آپ کو ان جائز لذتوں اور آسائشوں سے محروم کر لیتا ہے جو اللہ رب العزت نے اس کے لیے پیدا کی ہیں اور جو اخروی فلاح و کامرانی کے لیے توشہ راہ کے طور پر خدا نے مہیا کی ہیں۔ اس طرح دنیا اور اسباب دنیا کو صحیح طور پر نہ برتنے ہوئے حقوق اللہ اور حقوق العباد کے فریضے کی کما حقہ انجام دہی بھی اس کے لیے ناممکن ہو جاتی ہے جس کی بنا پر ابدی سعادت و کامرانی سے محرومی بھی اس کا مقدر بن جاتی ہے۔ مسیحی مذہب جس شکل میں ہم تک پہنچا ہے اس کی تعلیمات

پر طائرانہ نظر ڈالنے کے بعد ہی یہ مترشح ہوتا ہے کہ تیاگ، رہبانیت اور سٹیاس اس مذہب کے خاصہ اور وطیرہ ہیں۔ اس کی ساری توجہات کا مرکز صرف ایک سوال ہے اور وہ یہ کہ انسان کس طرح آسمانی بادشاہت میں داخل ہو جائے۔ یہی ایک سوال تمام مسیحی اخلاقیات کا مرکز و محور ہے اور جو کچھ حضرت عیسیٰ مسیح نے تعلیم دی ہے اس کا مقصد اسی نصب العین کے حصول کے لیے انسانی جماعت کو تیار کرنا ہے۔ (۱۶)

آسمانی بادشاہت مسیحیت کے نقطہ نظر سے ارتقائی منزل کا نام نہیں ہے بلکہ یہ دونوں ایک دوسرے سے متضاد و متضاد ہیں۔ دونوں کو ایک دوسرے کی ضد ماننے کا قدرتی نتیجہ یہ ہے کہ اس فکر کے علم برداروں کے نزدیک جو چیزیں زمینی بادشاہت و حکومت کے ساز و سامان میں داخل ہیں وہ آسمانی حکمرانی و بادشاہت کی نقیض بلکہ مانع و مزاحم ہیں اس لیے مسیحیت اس فکر کی نقیب و ترجمان ہے، زمینی حکمرانی و بادشاہت کے تمام اسباب و وسائل سے کلی اجتناب کے بعد ہی آسمانی بادشاہت میں شمولیت کی امید حقیقت میں بدل سکتی ہے۔ متی کی انجیل میں حضرت عیسیٰ کی طرف منسوب تعلیم یوں مرقوم ہے:

”اگر تو کامل ہونا چاہتا ہے تو جا اپنا مال اسباب بیچ کر غریبوں کو دے

دے اور میرے پیچھے ہو لے تجھے آسمان پر خزانہ ملے گا۔“ (۱۷)

لوقا کی انجیل میں حضرت مسیح کا یہ فرمان موجود ہے:

”اگر کوئی میرے پاس آئے اور اپنے باپ اور ماں اور بیوی اور اولاد اور

بہنوں بلکہ اپنی جان سے بھی نفرت نہ رکھے تو وہ میرا شاگرد نہیں ہو سکتا۔“ (۱۸)

متی کی انجیل میں ایک جگہ وضاحت سے مذکور ہے:

”میں تم سے کہتا ہوں کہ نہ اپنی جان کی فکر کرو کہ ہم کیا کھائیں گے؟ یا

کیا پہنیں گے؟ کیا جان خوراک سے اور بدن پوشاک سے بہتر نہیں ہے۔ ہوا

کے پرندوں کو دیکھو نہ بولتے ہیں نہ کاٹتے ہیں، نہ کوٹھیوں میں جمع کرتے ہیں پھر

بھی تمہارا آسمانی باپ ان کو کھلاتا ہے۔ کیا تم ان سے زیادہ قدر نہیں رکھتے.....

جنگلی سوسن کے درختوں کو دیکھو کہ وہ کیسے بڑھتے ہیں، نہ محنت کرتے ہیں، نہ کاٹتے

ہیں، پھر بھی میں تم سے کہتا ہوں کہ سلیمان بھی اپنی ساری شان و شوکت کے باوجود ان میں سے کسی کے مانند پوشاک پہنے ہوئے نہ تھا۔ پس جب خدا میدان کی گھاس کو جو آج ہے اور کل تنور میں جھونکی جائے گی، ایسی پوشاک پہناتا ہے تو اسے کم اعتقادو! تم کو وہ ضرور ہی پہنا دے گا۔ اس لیے فکر مند ہو کر یہ نہ کہو کہ ہم کیا کھائیں گے؟ کیا پہنیں گے؟“۔ (۱۹)

مذہب اسلام میں دنیا اور اسباب دنیا نہ شجر ممنوع کی حیثیت رکھتے ہیں اور نہ ہی متاع محبوب و مقصود جسے بے خوف و خطر تمام حدود و قیود کو پامال کر کے اپنانے کی جدوجہد کرنی چاہیے، بلاشبہ اصل منزل آخرت کی منزل ہے جس کی اصل فکر مندی کی جگہ جگہ قرآن و سنت میں تلقین کی گئی ہے (۲۰) اور یہی زندگی دراصل لافانی و لازوال ہے (۲۱)۔ ہاں چونکہ اس دنیا کو امتحان گاہ کی حیثیت حاصل ہے۔ اس لیے خیر و فلاح کا علم بردار اور کامیابی و کامرانی کے خوگر و خواہاں کے لیے اسے نظر انداز کرنا نہ یہ کہ صرف مناسب نہیں ہے بلکہ اپنے امتحان دہندہ کی حیثیت کو فراموش کر کے محرومی و بدبختی سے دوچار کرنے کے مترادف ہے۔ رسول مقبولؐ کے اس مقدس فرمان کی روشنی میں دنیا آخرت کی کھیتی ہے (۲۲)۔ چنانچہ خوشگوار اور شیریں ثمرات و نتائج کی توقع کاشت کیے بغیر ایک گونگے کے خواب اور ایک دیوانے کی بڑ علاوہ کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔ اسی طرح رسالت مآبؐ کے ایک فرمان کے مطابق دنیا کا ہر فرد ایک مسافر ہے اس کی اصل منزل آخرت ہے (۲۳)۔ منزل مقصود کی طلب و جستجو کا شوق نہ آلام و مصائب سے ایک مسافر کو بددل اور پست حوصلہ کرتا ہے اور نہ ہی حسین و دلکش اور جاذب نظر اشیاء اسے مسحور کرتے ہوئے منزل کے حصول میں مانع و مزاحم بنتی ہیں۔ ایک حازم و محتاط مسافر جو منزل کا طالب و مشتاق ہو سفر سے گریز و فرار اختیار نہیں کرتا ہے بلکہ وقتی مصائب و مشکلات کو سر کرتے ہوئے اور زوال آشنا اور فانی راحت و آسائش سے متمتع ہوتے ہوئے سفر کے اصول و ضوابط کا پابند ہو کر کشاں کشاں منزل کی طرف بڑھتا چلا جاتا ہے۔ بعینہ آخرت کا مسافر نہ تو دنیا و مافیہا کو نظر انداز کرتا ہے اور نہ ہی حزن و غم اور رنگینی و دلفریبی کے وقتی مناظر و مظاہر مسافر آخرت کے پایۂ استقامت میں پیدا کرتے ہیں۔

اسلام کے نزدیک دنیا کے مال و متاع اور اسباب و عوامل سامان آزمائش ہیں (۲۴)۔



اگر یہ جائز طریقے سے حاصل کیے جائیں اور جائز مصارف میں استعمال کیے جائیں تو نوازش خداوندی ہے جس کے حصول کے لیے بندہ خدا شب و روز کے متعدد اوقات میں بارگاہ الہی میں دست بدعا ہوتا ہے (۲۵)۔ بصورت دیگر یہ فتنہ اور ہلاکت و بربادی کے سامان ہیں (۲۶)۔ اس کے برخلاف مسیحیت روحانی ترقی اور آسمانی حکمرانی و بادشاہت کے لیے دنیا اور اسباب دنیا سے فرار و گریز کی دعوت دیتی ہے۔ دنیا میں نظام امن و عدل کا قیام صبر و تحمل، عاجزی و فروتنی، عفو و درگزر اور حلم و بردباری کے ساتھ ہی ساتھ سیاست و تعزیر اور قصاص و انتقام کے قانون پر مبنی ہے لیکن مسیحیت اس فکر کی قائل بلکہ علم بردار ہے کہ جب تک مکافات عمل کی قانونی دفعات کو بالائے طاق نہ رکھ دیا جائے آسمانی باپ کے نزدیک قصوروں کی معافی ممکن نہیں۔ حضرت مسیح کی تعلیم کو خود مسیحی علماء و دانشور جس رنگ میں پیش کرتے ہیں چالیس سے زیادہ علماء مسیحیت کی مدد سے ریورینڈ ڈومیلو کے ذریعہ تیار کردہ تفسیر انجیل کے ذریعہ اس کی ترجمانی ہوتی ہے۔ جس میں انجیل کا یہ عالم رقم طراز ہے:

”مسیح نے انسانی سیرت کے لیے وہ طرز پسند کیا ہے جو بڑی حد تک دنیا کے پسند کیے ہوئے طرز سے مختلف ہے۔ خود دلیری کی بجائے فروتنی اپنے حقوق پر جسے رہنے کی بجائے بدی کے آگے سر جھکا دینا اور وسعت طلبی کی جگہ قناعت، شرافت، عجز و صبر، ہمدردی، مصیبت میں خوش ہونا، درد سے راحت حاصل کرنا، یہ دنیا کو مسیحیت کے عطا یا ہیں..... مگر ایک مسیحی کے کیریئر کی سب سے زیادہ جامع تعریف غالباً یہ ہے کہ وہ ایک یکسو آدمی ہوتا ہے۔ وہ ایک پاؤں دنیا میں اور دوسرا دین (چرچ) میں نہیں رکھ سکتا۔ وہ ایک ہی وقت میں خدا اور متاع دنیا دونوں کی خدمت نہیں کر سکتا..... مسیح کے نزدیک دنیا کے پاس انسان کو اپنی خدمت پر مجبور کرنے کا سب سے بڑا ذریعہ دولت ہے، لہذا ایک مسیحی بننے کے لیے پہلی اور ضروری شرط یہ ہے کہ انسان دولت سے بے تعلق ہو جائے“۔ (۲۷)

عصر حاضر کا انسان تمام مادی آسائشوں اور خوش حالیوں کے باوجود امن و عدل کی نعمت عظمیٰ سے محروم ہے۔ چاہے یہ امن و آشتی ضمیر و عقیدہ کی ہو یا پھر سماجی، اقتصادی، تہذیبی اور سیاسی مشاغل و مصروفیات اور امور و معاملات میں ہو۔ اس انتشار و بد امنی اور بد عنوانی و فتنہ پروری

کی بنیادی وجہ ہے۔ فرد اور معاشرے کی زندگی پر انسان کے خود ساختہ قانون کا تسلط۔ اگر اس خدائی ضابطہ زندگی کی بالادستی زندگیوں پر جاری و ساری اور قائم و دائم ہو جائے جس میں نقص و کوتاہی کی کوئی گنجائش نہیں ہے اور جو تعصب و مفادات سے پرے ہو کر دوام و استحکام کے ساتھ پوری انسانیت کے خیر و فلاح کا ضامن ہوتا ہے تو بلاشبہ جس طرح عالم سادات تگوبینی طور پر خدائی ضابطے سے منسلک ہوتے ہوئے توافق و ہم آہنگی کے دلکش نظارے پیش کر رہا ہے۔ اسی طرح عالم ارضی بھی خدائی ضابطے کا پابند ہو کر انسانیت کو سعادت و کامرانی کی ضمانت دے سکتا ہے۔ عیسائیت نے محبت انسانی کو مرکزی حیثیت دے کر اور اسباب دنیا کو آسمانی بادشاہت کا نفیض بلکہ متضاد و متضاد قرار دے کر امن و عدل کے قیام کی دہائی دی ہے لیکن صداقت یوں نظر آتی ہے کہ اپنے مخصوص افکار و عقائد کے حصار میں رہتے ہوئے۔ عیسائیت انسانی جذبات و احساسات کو بہ نظر حقارت دیکھتی ہے اور اپنے علم برداروں کو کذب و فریب اور بدی و بغاوت سے نبرد آزما کی کا سبق دینے کی بجائے سپر انداز ہونے کی تلقین کرتی ہے۔ اسی طرح روحانیت کی افزائش اور آسمانی حکمرانی و بادشاہت میں شمولیت کے لیے اسباب دنیا سے تعلق کو زبردست مانع و مزاحم قرار دے کر انسانیت کو اس کے شرف و عظمت کی عملی تفسیر بننے سے روک دیتی ہے۔ اس کے برعکس اسلامی تعلیمات اپنے ماننے والوں کو صحیح طور پر بشر دوستی اور انسانیت نوازی کا نقیب و علم بردار بناتے ہوئے ظلم و عدوان، بغاوت و سرکشی اور تمام ستم کے منکرات و سیئات کا قلع قمع کرنے کی تلقین کرتی ہے تاکہ زمین پر امن و عدل کا بول بالا ہو۔ اسی طرح دنیا اور اسباب دنیا سے متعلق یہ تعلیمات معتدل نقطہ نظر کا حامل بناتے ہوئے اپنے ماننے والوں کو حیات ابدی کی مسرت جاودانی کے حصول کا اس طرح خوگر بنا دیتی ہیں کہ ایک طرف اس کے اشرف المخلوقات ہونے کا مقام مجروح نہیں ہوتا اور دوسری طرف ان کا وجود بنی نوع انسان کے لیے سراپا رحم و کرم اور امن و عدل بن جاتا ہے۔

### حوالہ جات و حواشی

(۱) التین: ۴۔ (۲) انجیل متی باب ۲۲ آیت ۳۵-۴۰۔

by Dr. Karan Singh, India Library, P

(۴) انجیل متی باب ۵ آیت ۳۸-۴۴ اور انجیل لوقا باب ۶ آیت ۲۷-۳۳۔ (۵) مسلم بن حجاج القشیری: الجامع الصحیح، ج ۱۶، کتاب البر، ص ۱۳۲-۱۳۵، بیروت۔ (۶) النساء: ۱۔ (۷) القشیری: الجامع الصحیح، ج ۱، کتاب البر، ص ۱۲۵-۱۲۶، بیروت۔ (۸) آل عمران: ۱۱۰۔ (۹) فصلت: ۳۴۔ (۱۰) الشوری: ۳۹۔ (۱۱) ابو عبد اللہ محمد بن اسماعیل البخاری: الجامع الصحیح، ج ۱، کتاب الاذان، ص ۹۱۔ (۱۲) البخاری: ج ۱، کتاب المظالم والقصاص، ص ۳۳۱۔ (۱۳) ص ۲۷۔ (۱۴) سید ابوالاعلیٰ مودودی: یہودیت و نصرانیت، مرتب: نعیم صدیقی، ص ۳۵۷-۳۵۸، طبع اول، جنوری ۱۹۸۳ء، مرکزی مکتبہ اسلامی، دہلی۔ (۱۵) ایضاً، ص ۳۷۷۔ (۱۶) انجیل متی باب ۱۹ آیت ۲۱۔ (۱۷) انجیل متی باب ۱۹ آیت ۲۱۔ (۱۸) انجیل لوقا باب ۱۲، آیت ۲۶۔ (۱۹) انجیل متی باب ۶ آیت ۲۵-۳۱۔ (۲۰) الحشر: ۱۸۔ (۲۱) العنکبوت: ۶۴، الاعلیٰ: ۱۷۔ (۲۲) الملک: ۲۔ (۲۳) ابو عبد اللہ احمد بن محمد ابن حنبل: المسند، ج ۲، ص ۲۴۔ (۲۴) ایضاً۔ (۲۵) التغابن: ۱۵۔ (۲۶) البقرہ: ۲۰۱۔ (۲۷) المنافقون: ۹۔ (۲۸) Revrend Dumellew: Commentery on the holy Bibli, ۳۵۰۔

## دارالمصنّفین کا سلسلہ اسلام اور مستشرقین

۱- اسلام اور مستشرقین (اول)	سمینار کی روداد	قیمت: ۷۰ روپے
۲- اسلام اور مستشرقین (دوم) جدید	سمینار میں پڑھے گئے مقالات	قیمت: ۱۵۰ روپے
۳- اسلام اور مستشرقین (سوم) جدید	معارف میں شائع شدہ مقالات	قیمت: ۱۵۰ روپے
۴- اسلام اور مستشرقین (چہارم) جدید	علامہ شبلی نعمانی کے مقالات	قیمت: ۱۵۰ روپے
۵- اسلام اور مستشرقین (پنجم) جدید	مولانا سید سلیمان ندوی کے مقالات	قیمت: ۶۰ روپے
۶- اسلام اور مستشرقین (ششم) جدید	منتخب عربی مقالات اردو ترجمہ	قیمت: ۲۰۰ روپے
۷- اسلام اور مستشرقین (ہفتم) مجلد	متعدد بلند پایہ اردو مقالات	قیمت: ۲۵۰ روپے

## اخبار علمیہ

### ”معرض ”محمد رسول اللہ“ کا افتتاح“

مدینہ منورہ کو اسلامی تہذیب و ثقافت کے دار الخلافہ کے طور پر منتخب کر لیا گیا ہے، اسی حیثیت کے مدنظر وہاں ”محمد رسول اللہ“ کے عنوان سے ایک مستقل نمائش گاہ قائم کی گئی ہے، جس کا افتتاح امیر فیصل بن سلیمان بن عبدالعزیز نے کیا۔ یہ میوزیم آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے آثار اور تعلیمات و ہدایات پر اس طرح ترتیب دیا گیا ہے کہ حیات طیبہ گویا مجسم شکل میں سامنے آ جاتی ہے، اس میں جدید ٹکنالوجی کا بھی بڑا دلاویز استعمال کیا گیا ہے۔ یہ میوزیم دو حصوں میں ہے، پہلے حصہ میں آپ کے سوانح حیات کے ان پہلوؤں کو شامل کیا گیا ہے جن سے آپ کی عظمت، فضیلت اور آپ کے مقام و مرتبہ کا نقش نظر سے دل کی گہرائیوں میں ثبت ہو جائے، آیات قرآنیہ اور احادیث صحیحہ پر مشتمل نہایت دیدہ زیب طغرے تیار کیے گئے ہیں۔ دوسرے حصہ میں عہد کی و مدنی کے واقعات سیرت، حسب و نسب اور آپ کی عائلی زندگی سے متعلق طغرے اور تختیاں ہیں، کچھ ایسی تختیاں بھی ہیں جن سے مسجد نبوی کی تاسیس سے دور حاضر تک کے عہد بہ عہد تعمیراتی مراحل کی تاریخ محسوس انداز میں سامنے آ جاتی ہے، یہی نہیں عہد نبوی کی تعمیرات کے مرقعے بھی ہیں جن کو دیکھ کر دیکھنے والا خود کو اسی ماحول میں موجود پاتا ہے۔ (العربیہ نیٹ، الفن والثقافہ، ۱۳ اکتوبر ۲۰۱۳ء)

### ”پیروں سے کنٹرول والی کار کی ایجاد“

امارات یونیورسٹی کے شعبہ انجینئرنگ کی ایک طالبہ حریم المرزوقی نے اعلیٰ تعلیم امریکہ میں حاصل کی، اس ذہین طالبہ نے پیروں سے چلائی جانے والی ایسی کار ایجاد کی ہے جس کو امریکہ کے پیٹ آفس کی جانب سے عمدہ ترین اور دنیا کی پہلی ”پیروں سے چلنے والی کار“ قرار دیا گیا ہے۔ رپورٹ کے مطابق اس نے یہ کارنامہ امریکہ کے اختراعی و ٹکنیکی فاؤنڈیشن کے تعاون سے انجام دیا ہے، گزشتہ دنوں دبئی میں اس کی نمائش کا اہتمام بھی کیا گیا، حریم مرزوقی کے اساتذہ نے کہا کہ یہ ایجاد ہمارے لیے باعث فخر اور تمام مسلمان طلبہ کے لیے قابل تقلید ہے۔

حریم نے کہا کہ بچپن سے ہی میں نے سوچ رکھا تھا کہ مجھے ایسی چیز بنانا ہے جو اس سے پہلے کسی نے نہ بنائی ہو، اس کار کے بنانے کا محرک دونوں ہاتھوں سے محروم امریکہ کی ایک خاتون پائلٹ کے جہاز اڑانے کا کارنامہ ہے۔ یہ خیال اس کارنامہ سے آیا کہ ایسی کار تیار کی جائے جو بے دست لوگ چلا سکیں، اس منصوبہ پر ایک سال صرف ہوا، رپورٹ کے مطابق پیروں کے رکھنے کی جگہ ایک (خود کار) بورڈ نصب کیا گیا ہے جس میں بریک، گیر اور اسٹیرنگ سمیت گاڑی کو قابو میں رکھنے کا پورا نظام موجود ہے، امارات میں جلد ہی اس قسم کے معذور لوگوں کے لیے یہ کار دستیاب ہوگی۔ اس کامیاب ایجاد کے بعد حریم المرزوقی نے صرف دماغ کے اشارے سے چلنے والی کار بنانے کا عزم ظاہر کیا ہے۔ (تفصیلی رپورٹ، منصف حیدر آباد، یکم نومبر ۲۰۱۳ء میں دیکھی جاسکتی ہے)

### ”مصحف قدیم کی دریافت“

ترکی کے شہر بودروم کی ایک مسجد کے امام کو قرآن مجید کا ایک نسخہ ملا ہے جس کے بارے میں خیال کیا جاتا ہے کہ وہ بارہ سو سال قدیم ہے۔ اس کے علاوہ تفسیر قرآن پر مشتمل متعدد مخطوطات بھی ملے ہیں۔ فی الحال مصحف و مخطوطات کی عمر کے باقاعدہ تعین کے لیے ایک تحقیقاتی ٹیم کو ذمہ داری سونپی گئی ہے۔ (صراط مستقیم، برنگھم، اکتوبر ۲۰۱۳ء، ص ۳۱)

### حضرت مجدد الف ثانیؒ پر عالمی سمپوزیم

۱۵/۱۷ اکتوبر ۱۳ء میں امام ربانی مجدد الف ثانیؒ کی حیات و خدمات پر ایک عالمی سمپوزیم استنبول میں منعقد ہوا۔ اس میں ۳۰ ملکی اور ۱۰ بیرون ممالک کے مندوبین نے شرکت کی۔ سمپوزیم میں پیش کیے گئے مجموعہ مقالات جلد ہی شائع کیے جائیں گے اور امید ہے یہ مجموعہ امام ربانیؒ کی شخصیت اور کارناموں پر ایک دستاویز ہوگا۔ سمپوزیم میں کل نوشتیں ہوئیں۔ امام ربانیؒ کی حیات اور عہد، خدمات، مذہبی، صوفیانہ اور عالمانہ افکار و نظریات، اناطولیہ اور اناطولیہ سے باہر مجددی اثرات جیسے عناوین کے تحت مقالات کے سات سیشن ہوئے، جن میں قرآن و سنت کے مطابق امام ربانیؒ کی زندگی اور مکتوبات امام ربانیؒ مع حواشی و تعلیقات شائع کرنے پر خاص طور پر زور دیا گیا۔ وحدت الوجود اور وحدت الشہود سے متعلق امام ربانیؒ کے نظریات پر

زوردار بحث ہوئی تھی۔ ایک نشست میں متکلمانہ مسائل اور رخصت وغیرہ موضوع بحث تھے، اکبر کے دین الہی کے فروغ کے خلاف امام ربانی کی خدمات کا جائزہ لیا گیا کہ امام ربانی کی وجہ سے ہی اکبر کی یہ تحریک نتیجہ کے لحاظ سے صفر بلکہ بے اثر رہی۔ آج مغربی فلاسفہ و مفکرین عقلیت، انسانیت اور تائیدیت کے نام پر مسلمانوں کو قرآنی تعلیمات کی اصل روح اور حقیقی معانی و مفاہیم سے دور کرنے کی کوشش میں مصروف ہیں، ایسے حالات میں امام ربانی کے صوفیانہ نظریات اور ان کی روحانی تعلیمات بڑی اہم اور قابل قدر ہیں اور عالم اسلام میں قیام امن اور احیائے دین میں ان کے افکار سے بڑی مدد لی جاسکتی ہے۔ ترکی کے علاوہ ازبکستان، اٹلی، نیوزی لینڈ، ہندوستان اور پاکستان کے فضلاء اس میں شریک ہوئے۔ پروفیسر ڈاکٹر عارف نوشاہی، ڈاکٹر پرویز غلام معین الدین، ڈاکٹر محمد اقبال مجددی پاکستان سے اور ہندوستان سے ڈاکٹر عطا خورشید نے اس عالمی سمپوزیم میں شرکت کی۔ (یہ اطلاع ڈاکٹر عطا خورشید، لاہور برین علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے معارف کو فراہم کی)

### ”روس میں اسلامی ٹی وی چینل کا آغاز“

روسی مسلمانوں اور دنیا کی دوسری قوموں کے درمیان باہم روابط کو مستحکم بنانے کے لیے روس میں ایک اسلامی ٹی وی چینل کا آغاز کیا گیا ہے۔ فی الحال اسے انٹرنیٹ پر دیکھا جاسکتا ہے۔ اس کے ڈائریکٹر رستم عارف جانوف کے بیان کے مطابق آئندہ سال اس کو باقاعدہ عام ٹی وی چینلوں پر دیکھا جاسکے گا، جن میں قرآن مجید اور احادیث پر مشتمل پروگراموں کو خاص طور پر نشر کیا جائے گا اور مسلمانوں کے مسائل پر غور کرنے اور ان کے حل کی تلاش کے لیے عالم اسلام کی نامور شخصیتوں سے بھی یہ ٹی وی ادارہ رابطہ قائم کرے گا۔ (صراط مستقیم، ہنگام، اکتوبر ۲۰۱۳ء)

ک، ص اصلاحی

شبلی کی ادبی و فکری جہات

ڈاکٹر شمس بدایونی

قیمت: ۲۰۰ روپے

## معارف کی ڈاک

### بارہویں و تیرہویں صدی ہجری کے چند اہم ہندوستانی قلمی سفرنامے

۶۹ ماڈل ٹاون، ہمک،  
اسلام آباد (پاکستان)

معارف نومبر ۲۰۱۳ء میں ڈاکٹر محمد عتیق الرحمن صاحب کا مضمون ”بارہویں و تیرہویں صدی ہجری کے چند اہم ہندوستانی قلمی سفرنامے“ پڑھا۔ یہ مضمون بقول ان کے تین ایسے سفرناموں کے تعارف پر مبنی ہے جو تاحال غیر مطبوعہ ہیں۔ فاضل مضمون نگار کی نظر سے کچھ حقائق یا معلومات اوچھل رہے ہیں۔ ان کا بطور استدراک ذکر ضروری ہے۔

- ۱۔ بیان واقع از خواجہ عبدالکریم، ڈاکٹر کے بی نسیم نے مرتب کیا تھا اور اسے ادارہ تحقیقات پاکستان، پنجاب یونیورسٹی نے ۱۹۷۰ء میں شائع کیا۔
- ۲۔ زبدۃ الاخبار فی سوانح الاسفار پر اس سے پہلے بھی تعارفی مقالات چھپ چکے ہیں، جیسا کہ:

الف: شریف حسین قاسمی، ”دریچہ ای بہ شیراز قرن نوزدہم میلادی“،  
سہ ماہی دانش، اسلام آباد، ۱۹۸۵ء، شمارہ ۱، ص ۸۸-۱۰۱  
ب: شریف حسین قاسمی، ”زبدۃ الاخبار فی سوانح الاسفار“، آشنا،  
تہران، سال ۴، شمارہ ۲۴ (۱۹۹۵ء)

ج: سید حسن عباس، ”زبدۃ الاخبار فی سوانح الاسفار (محیط ثالث) کا  
نادر مخطوطہ“، ادراک، گوپال پور، شمارہ ۴، ۲۰۰۴ء، ص ۶۱-۶۸

عارف نوشاہی



## دارالمصنفین اور مولانا مودودیؒ

یوسف گوڑہ، چیک پوسٹ،  
حیدرآباد  
۲۰۱۳/۱۱/۱۹ء

مکرمی، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

”معارف“ پابندی سے مل رہا ہے۔ شکریہ، اکتوبر ۲۰۱۳ء کے معارف میں پروفیسر شکیل اوج صاحب کا مضمون ”شیخ الہند مولانا محمود حسن کی قرآن فہمی“ قابل داد اور قابل یاد مضمون ہے قرآنیات میرا موضوع ہے بلکہ جینے کا مقصد وحید ہی خدمت قرآن ہے۔

معارف اور مولانا مودودیؒ میں ایک معروف مناسبت ہے۔ مولانا مودودیؒ کی معرکتہ الآراء کتاب جس نے مولانا مودودیؒ کو عالم سے علامہ اور محقق بنایا اور ان کی زندگی کو با مقصد بنانے میں بنیادی رول ادا کیا وہ ”الجہاد فی الاسلام“ ہے۔ مولانا مودودیؒ کے مضامین الجمیۃ دہلی میں ۲ فروری ۱۹۲۷ء سے ”اسلام کا قانون جنگ“ کے عنوان سے چھپے تھے ”دارالمصنفین، اعظم گڑھ نے اس کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھا اور کتابی شکل میں الجہاد فی الاسلام کے نام سے ۱۹۲۸ء میں شائع کر دیا۔

دسمبر ۱۹۲۶ء میں شدھی تحریک کے بانی سوامی شردھانند کی نفرت انگیز تحریک و تحریک بھرپور اور مدلل جواب دینے کی ضرورت اور جہاد کی حقیقت سے ملت کو اور مخالفین کو قرآن، اسلام اور سیرت سرور کائناتؐ کی اصل تعلیمات سے واقف کرانے کے مقصد سے انہوں نے یہ سلسلہ شروع کیا تھا۔ اس کے علاوہ اس وقت عالمی جنگ اور صلیبی اور یہودی سازشیں بھی اس کتاب کی تالیف کا محرک تھیں۔ یہ بات بھی ہے کہ مولانا مودودیؒ نے مولانا محمد علی جوہر کی جامع مسجد کی تقریر اور اپیل سے متاثر ہو کر یہ موضوع اختیار کیا گو مولانا مودودیؒ اس وقت صرف ۲۳ سال کے نوجوان تھے اور الجمیۃ کے ایڈیٹر بھی تھے مگر اعلیٰ علمی حلقہ میں ابوالاعلیٰ کو متعارف کرانے میں ”معارف“ نے قابل قدر اور ناقابل فراموش رول ادا کیا ہے اور مجھے معارف سے اسی لیے محبت ہے۔

کتاب ”مقصد تخلیق انسان موجبات فلاح و موجبات خسران“ آپ کے ادارہ کے لیے (۲۰) کاپیاں تحفۃً بھجوا یا تھا۔ جولائی ۲۰۱۳ء سے اکتوبر ۲۰۱۳ء ”چار ماہ کا چلہ“ مکمل کر لینے کے باوجود آپ تک نہیں پہنچ پائی ہے۔

احقر احمد سعید

## مطبوعات جدیدہ

عرب و ہند کی علمی و ادبی خدمات: از ڈاکٹر محمد عتیق الرحمن، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۳۰۰، قیمت: ۱۲۱ روپے، پتہ: مرکز تحقیقات اسلامی، گلشن عتیق، نیو عظیم آباد کالونی، پٹنہ اور کتب خانہ انجمن ترقی اردو، اردو بازار، جامع مسجد دہلی و بک امپوریم، بنری باغ، پٹنہ-۳۔

عربی لغت نویسی، جدید عربی شاعری، مصر کی ناول نگاری اور محمد حسین ہیکل کے عنوانوں کے تحت عربوں اور باقی نومضامین میں بعض ہندوستانی اہل قلم کی علمی و ادبی خدمات پر سیمیناری مقالوں کے اس مجموعہ میں مخطوطہ شناسی، ترجمے کی ضرورت اور ہندوستان میں عربی ادبی نگارشات کی تدوین و تحقیق کا ایک جائزہ بھی شامل ہے۔ سیمیناری مقالات کی وجہ سے بظاہر ترتیب و تنسيق کی کمی نظر آتی ہے لیکن موضوعات کے تنوع اور معلومات کی کثرت سے یہ کتاب بڑی مفید اور کارآمد ہوگئی ہے۔ فاضل مصنف عرصہ تک خدا بخش لائبریری کے شعبہ تحقیق سے وابستہ رہے اور ذہن و مزاج و مذاق علمی کے لحاظ سے وہ با مقصد اور افادی ادب سے پیوستہ رہے، رابطہ ادب اسلامی کے وہ باقاعدہ رکن ہیں، ملک کی مختلف جامعات اور اداروں میں وہ اپنے نظریات و رجحانات پیش کرتے رہتے ہیں۔ ان کی تحریر کی بڑی خوبی اسلوب کی سادگی اور فکر کی پاکیزگی ہے اور زیر نظر منتخب مجموعہ مقالات سے اس کی تصدیق ہوتی ہے، ہیکل اور پریم چند کا موازنہ، وسعت نظر کا نتیجہ ہے تو مخطوطات کی روشنی میں عربی ادبیات ہند ان کی محنت و جستجو کا آئینہ ہے، جدید عربی شاعری میں ایمان کی بہار سے ذوق سلیم کا اندازہ ہوتا ہے جس میں انہوں نے مغرب زدہ جدید عربی شاعروں کے متعلق درست لکھا کہ یہ احساس کمتری کے شکار اور اپنے علمی و ادبی ورثہ پر فخر کرنے کی بجائے شرمندہ ہی نظر نہیں آتے بلکہ ان کو حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ اسی اظہار میں یقیناً اردو کی ادبی صورت حال ان کے پیش نظر ہے۔ خدا بخش خاں پران کا مضمون گویا ادائے قرض ہے جس میں انہوں نے خدا بخش خاں کی عالمانہ، دانش ورانہ اور قانون میں ماہرانہ شان کو بڑے مدلل انداز میں بیان کیا ہے اور اس میں علامہ شبلی کے متعلق خدا بخش خاں کے بڑے پُراثر جملے بھی اس وقت کے آگئے ہیں جب علامہ شبلی کی جگہ حیدر آباد میں خدا بخش خاں کا انتخاب کیا گیا تھا، آزاد بلگرامی، سید صدیق حسن خاں، عبدالعزیز میمنی، مولانا گیلانی، شاہ ولی اللہ اور ہندوستان میں خدمت حدیث کے تعلق سے مضامین قدر کے لائق ہیں اور بقول مقدمہ نگار مولانا سید محمد رابع ندوی یہ مفید اور لائق ستائش کوشش ہے۔

آقائے سخن وسیم خیر آبادی: از جناب فرید بلگرامی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۳۸۸، قیمت: ۲۰۰ روپے، پتہ: فرید بلگرامی، بلگرامی بلڈنگ، میاں سرائے، خیر آباد، سینٹاپور یو پی اور عارف علی انصاری، لطیف مارکیٹ، خیر آباد، سینٹاپور اور دانش محل، امین آباد، لکھنؤ۔

سینٹاپور کا قصبہ خیر آباد ان بستیوں میں ہے جو واقعی اسم با سمی ہیں، ایک ریاض خیر آبادی ہی اس کی مردم خیزی کے لیے کافی ہیں لیکن مولانا فضل حق خیر آبادی، رئیس احمد جعفری مضطر اور مائل خیر آبادی جیسے مشاہیر کے نام آبادی کے خیر ہونے پر مستزاد ہی کہے جائیں گے۔ یہ تو چند مشاہیر ہیں، ان کے علاوہ ایک اور کہکشاں بھی اس زمین کے آسمان کو روشن تر بناتی ہے جس میں حضرت وسیم غالباً سب سے نمایاں ہیں، امیر مینائی کے شاگرد اور فراق گورکھپوری کے استاد اور خود ریاض خیر آبادی کے مستشار کی حیثیت سے ان کی قدرو قیمت کا تعین مشکل نہیں، یہ اور بات ہے کہ ان کو وہ بال و پر نہیں ملے جس سے شہرت کو پرواز میں آسانی ہو، اس کتاب کے لائق مصنف نے جب وسیم خیر آبادی کے مطالعہ کو مقالہ تحقیق کا موضوع بنایا تو شاید اس وقت ان کو بھی خبر نہ تھی کہ وہ کس خزانہ علم و ادب کی دریافت کا غیر معمولی کارنامہ انجام دینے والے ہیں، جس شاعر کے شاگرد سینکڑوں کی تعداد میں ہوں اس کو واقعی یہ کہنے کا حق ہے کہ ع خدا بخشنے کوئی ایسا سخن و راب کہاں ہوگا۔ یہ احساس بھی بجا تھا کہ

کہتے ہیں نہ جو کہتا بے مثل وسیم اشعار آقائے سخن کیوں وہ مشہور ہوا ہوتا  
لطف تو تب ہی ہے جب شاعر کو اپنی زباں کے اثر کا یقین ہو

اثر سا ہے اثر اس کی زباں میں وسیم ایک شاعر جادو بیاں ہے  
یا یہ کہ تاثیر کس غضب کی ہمارے سخن میں تھی

فراق نے شاید استاد کی تعظیم میں دہلی کے ساتھ لکھنؤ کی جگہ خیر آباد کو دبستان قرار دیا، لیکن دبستان لکھنؤ کے عناصر میں داخلی جذبات کی جگہ معشوق کے خارجی اوصاف، رعایت لفظی، معاملہ بندی، نازک خیالی اور سب سے بڑھ کر زبان کی صفائی اور شستگی، اشعار کی روانی اور بندشوں کی چستی اور مضامین میں شوخی، رنگینی اور عنائی کے جو اوصاف بیان کیے جاتے ہیں، وسیم صاحب کی شاعری میں ان کا ظہور ہی نہیں کامل ظہور ہے۔

سورخ پڑ گئے میرے دل میں تر لحد کیس ٹھنڈی چوڑیاں جو مرے سو گوار نے  
شام وصال تجھ کو لگائے ہیں چار چاند رنگ حنا نے غارے نے افشاں نے ہار نے

الفت میں زلف ورخ کی سپید و سیاہ دہر دکھلائے مجھ کو گردش لیل و نہار نے  
ہر گل بہار گل میں بنا ہے چراغ طور اس مرتبہ تو آگ لگا دی بہار نے  
قتل ہونے نہ دیا اس کی نزاکت نے مجھے رہ گیا اپنا سامنہ لے کے وہ قاتل میرا  
لڑائی کفر و ایمان میں اگر ہو تمہاری زلف ادھر ہو رخ ادھر ہو  
تجھے پامال کرنے سے غرض ہے تری مہندی ہو، دل ہو یا جگر ہو

لیکن کمال یہ ہے کہ اس رنگ کے ساتھ داخل جذبات کی کمی نہیں، عام روش لکھنؤ کے برخلاف غزلیں زیادہ تر مختصر ہیں جن سے خواہ مخواہ قافیہ پیمائی کے ابتذال سے حفاظت ہوتی جاتی ہے۔ یہاں وسیم کی شاعری پر تبصرہ مقصود نہیں ورنہ تفصیل سے بتایا جاتا کہ خمریات میں ریاض ہی نہیں وسیم بھی غرق ہیں، ممکن ہے آتش میں خولجہ حافظ کا جو جوش ہے وسیم میں کم ہو لیکن سرمستی میں وسیم، ریاض و آتش سے آنکھیں ضرور ملاتے ہیں۔ خوب ہوا جو لائق مصنف نے یہ سارا دستیاب کلام جمع کر دیا مگر اس سے بھی زیادہ دلچسپ وہ مباحث ہیں جن میں وسیم صاحب نے اپنے تلامذہ کے کلام کی اصلاح کی ہے، یہ اردو کے سنجیدہ طالبوں کے لیے بار بار پڑھنے کے لائق ہیں، باقی اس کتاب میں وہ سب کچھ ہے جو ایک تحقیق کے حسن قبول کے لیے ضروری ہے جیسے زبان دانی، قصیدہ گوئی، امیر اللغات و نور اللغات کی تالیف میں تعاون، صحافت، امیر و داغ، گلچیں، دامن گلچیں و تحفہ خوشترکی بازیافت وغیرہ۔ گلچیں آج سے قریب سوا سو سال پہلے اس زمانہ کے لحاظ سے گلدستہ کی شکل میں ماہنامہ بن کر نکلا، جس میں مصرع طرح پر بیسیوں غزلیں ہوتی تھیں، کیا دور رہا ہوگا نظام دکن کا مصرع دیا گیا کہ ع یہ چوٹی کس لیے پیچھے پڑی ہے

ریاض، حسرت، ثاقب، برق، تسلیم، عزیز، مضطرب کی تفصیلیں ہیں، ایک سے ایک بڑھ کر، وسیم نے بھی مصرع لگایا کرے گی چوٹ کس پر چھپ کے ظالم۔ یہ چوٹی کس لیے پیچھے پڑی ہے

ایک اور بھی مصرع لگایا لیکن اس کا لطف براہ راست کتاب سے لیا جاسکتا ہے۔ ایک اور دلچسپ بات اسی گلچیں کے ذکر سے ملی کہ اس میں جگر بسوانی کا ایک ناول در و جگر قسط و ارشائع ہوا تھا اور ”یہ دراصل جگر بسوانی اور عطیہ فیضی کے معاشرے کی داستان ہے“۔ اس انکشاف پر حضرت وسیم کا ہی ایک مصرع دہرایا جاسکتا ہے کہ ع کوئی ہماری طرح بھی گرم سفر نہ ہو۔ ایسی دلچسپ اور مفید کتاب کے لیے لائق مصنف ہر طرح مبارک باد کے مستحق ہیں۔ کتابت کے سہو و غلطی کا ذکر اب کیا کیا جائے۔

## رسید مطبوعہ کتب

- ۱- ابن صفی مشن اور ادبی کارنامہ: محمد عارف اقبال، اردوبک ریویو، ذیلی منزل نیوکوہ نور ہوٹل، پٹودی ہاؤس، دریا گنج، نئی دہلی۔ قیمت: ۵۹۵ روپے
- ۲- اقبالیات اور قرۃ العین حیدر: نسیم عباس چوہدری، اقبال اکادمی پاکستان، چھٹی منزل ایوان اقبال، لاہور۔ قیمت: ۲۵۰ روپے
- ۳- حسرت موہانی، حیات و خدمات: شاہد مابلی، غالب انسٹی ٹیوٹ، ایوان غالب مارگ، نئی دہلی، ۲۔ قیمت: ۲۰۰ روپے
- ۴- داستان میری (جلد اول): مولانا ڈاکٹر تقی الدین ندوی، جامعہ اسلامیہ مظفر پور، اعظم گڑھ، نعیمیہ بک ڈپو، دیوبند۔ قیمت درج نہیں
- ۵- دیوان امداد امام اثر: سرور الہدی، غالب انسٹی ٹیوٹ، ایوان غالب مارگ، نئی دہلی، ۲۔ قیمت: ۳۰۰ روپے
- ۶- سفرنامہ برطانیہ (یعنی مولانا محمد عمران خاں ندوی ازہری کے سفر انگلینڈ کی روداد): بقلم پروفیسر محمد حسان خاں ندوی، مکتبہ دین و دانش، ۱۳ مسجد شکور خاں روڈ، بھوپال۔ قیمت: ۳۰۰ روپے
- ۷- عرب و ہند کی علمی و ادبی خدمات (مجموعہ مقالات) جلد اول: ڈاکٹر محمد عتیق الرحمن، مرکز تحقیقات اسلامی گلشن عتیق، نیو عظیم آباد کالونی، پٹنہ۔ قیمت: ۱۴۱ روپے
- ۸- کلیات غزل..... فیہا: ڈاکٹر راہی فدائی، ابوالحسن اکیڈمی، بنگلور۔ قیمت: ۴۰۰ روپے
- ۹- نقد غزل: ڈاکٹر تابش مہدی، انجمن ترقی اردو ہند، اردو گھر، راؤ زایوینیو، نئی دہلی۔ قیمت: ۱۵۰ روپے
- ۱۰- یگانہ روزگار۔ مولانا عبدالسلام ندوی: ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، ادبی دائرہ، عقب آواس وکاس کالونی (رحمت نگر)، اعظم گڑھ۔ قیمت: ۲۵۰ روپے